ترجمہ: روایت اور فن

مرتبہ

نثار احمد قریشی

نظرِ ثانی

محمد شریف کنجاہی

مقتدرہ قومی زبان ۰ اسلام آباد

ترجمہ: روایت اور فن

جملہ حقوق بحق مقتدرہ محفوظ ہیں

سلسلہ مطبوعات :
مقتدرہ : ۳۱
دارالتصنیف : ۲۲

○

طبع اول : ستمبر ۱۹۸۵ء
تعداد : ایک ہزار
قیمت : مجلد : ۵۵ روپے
غیر مجلد : ۳۰ روپے
طابع : مطبعة المکتبة العلمیة
۱۵ - لیک روڈ ، لاہور
ناشر : ڈاکٹر وحید قریشی
(صدر نشین)
مقتدرہ قومی زبان
مکان نمبر ۱۰ ، گلی نمبر ۳۲
سیکٹر ایف ۱/۸ ،
اسلام آباد -

ترجمہ: روایت اور فن

مرتبہ

نثار احمد قریشی

نظرِ ثانی

محمد شریف کنجاہی

مقتدرہ قومی زبان ۞ اسلام آباد

۱۹۸۵ء

عرض ناشر

فن ترجمہ سے متعلق مقتدرہ کے بعض خصوصی منصوبے زیر کار ہیں۔ ان میں اصول ترجمہ پر ایک سیمینار کا انعقاد بھی شامل ہے۔ ضروری ہے کہ اس موضوع پر پہلے سے موجود ادبی ذخیرے کا جائزہ بھی لیا جائے اور منتخب مقالات کا ایک مجموعہ پیش کر دیا جائے تاکہ جدید فکری تناظر میں ماضی کی روایات بھی شامل ہو سکیں اور اصول و مبادی کی تمام تر جہتیں سامنے آ سکیں۔ چنانچہ ''ترجمہ : روایت اور فن'' اسی خیال سے پیش کیا جا رہا ہے۔

فہرست مضامین

		صفحہ
دیباچہ	مرتب	۱
اردو میں نثری تراجم کی روایت کا مختصر جائزہ	مرتب	۳
الف - ترجمے کی ضرورت و اہمیت :		۱۷
-ترجمے کی ضرورت	پروفیسر جیلانی کامران	۱۹
-ترجمے کی ضرورت	انیس ناگی	۲۸
ب - ترجمے کے اصول :		۳۷
-دور تراجم	حاجی احمد فخری	۳۹
-ترجمے کے اصول	سید باقر حسین	۵۵
-ترجمہ، تالیف، تلخیص اور اخذ کرنے کا فن	ڈاکٹر سہیل احمد خان	۶۵
-فن ترجمہ کے اصول و مبادیات	سید غفران الجیلی	۷۹
ج - مسائل و مشکلات :		۹۹
-ترجمے کے بنیادی مسائل	ظ ۔ انصاری	۱۰۱
-ترجمہ کے چند پہلو (مذاکرہ)	سید ہاشمی فرید آبادی، عبدالمجید سالک، ممتاز حسین	۱۲۹
-گر ترجمے سے فائدہ اخفائے حال ہے	محمد حسن عسکری	۱۴۱
-ترجمے کے مسائل	ڈاکٹر جمیل جالبی	۱۵۳
-تراجم اور اصلاح سازی کے مسائل	آل احمد سرور	۱۵۹
کتابیات :		۱۷۷

دیباچہ

کچھ عرصہ پیشتر ایک تحقیقی منصوبے کی تکمیل کے دوران میں فن ترجمہ سے متعلق کسی کتاب کے مطالعے کی ضرورت پیش آئی - متعدد کتب خانے چھان مارے مگر اس موضوع پر کوئی کتاب نہ ملی - قدیم و جدید متعدد رسائل کی ورق گردانی کے بعد چند مضامین ضرور ہاتھ لگے جن سے کسی حد تک اپنی ضرورت پوری ہو گئی مگر بعد میں یہ سوچ کر کہ علم کے میدان میں دوسرے لوگوں کو بھی ایسی ہی ضرورت پیش آ سکتی ہے ان میں سے چند اہم مضامین کو کتابی شکل میں یکجا کر دیا گیا ہے -

غالباً اس بات سے انکار ممکن نہیں کہ ترجمہ ہر دور میں ہر زبان کی اہم ترین ضرورت رہا ہے - یہ مختلف قوموں، زبانوں اور ثقافتوں کے درمیان پڑے ہوئے اجنبیت کے پردے چاک کر کے انہیں ایک دوسرے سے قریب لاتا ہے اور ہر زبان کی ترقی پھیلاؤ اور وسعت میں بھی معاون ثابت ہوتا ہے - ترجمہ نگاری کی اس قدر اہم حیثیت کے باعث لازم ہے کہ اس فن کی ضروریات اور تقاضوں سے بھی آگاہی حاصل کی جائے- کیونکہ یہ فن جس قدر اہم ہے اسی قدر مشکل بھی ہے - ترجمہ کیوں ضروری ہے ؟ اچھے ترجمے کی پہچان کیا ہے ؟ ترجمے کے اصول کون سے ہیں ؟ یہ سب ایسے سوالات ہیں جو ترجمہ نگاری کے ضمن میں اٹھائے جا سکتے ہیں - کتاب میں شامل چند مضامین انہی موضوعات سے بحث کرتے ہیں - تاہم ترجمے سے متعلق میرے خیال میں ابھی بہت کچھ لکھنا باقی ہے -

میں استاد مکرم جناب ڈاکٹر وحید قریشی کا بے حد ممنون ہوں کہ یہ سب انہی کی تحریک اور مشفقانہ راہنمائی کے سبب ممکن ہو سکا

rekhta

ہے ۔ ان تمام اہل قلم حضرات کا بھی مشکور ہوں کہ جنھوں نے اپنی نگارشات اس کتاب میں شامل کرنے کی اجازت دی اور اسے قابل مطالعہ بنایا ۔ عزیز دوست اور ہم جماعت محمد اسماعیل خان نے مسودے کی نظر ثانی میں میری مدد کی جس کے لیے ان کا شکر گزار ہوں ۔

کتاب کے آغاز میں راقم نے اردو میں نثری تراجم کی روایت کا مختصر جائزہ لیا ہے ۔ آخر میں ایک ببلوگرافی ترتیب دی گئی ہے ۔ امید ہے کہ زیر نظر کتاب علمی دنیا کی اہم اور دیرینہ ضرورت کو پورا کرنے میں کسی قدر معاون ثابت ہوگی ۔

نثار احمد قریشی
(اسسٹنٹ پروفیسر) شعبۂ اردو
علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی اسلام آباد
۱۱ نومبر ۱۹۸۳ء

نثار احمد قریشی

اردو میں نثری تراجم کی روایت کا مختصر جائزہ

دنیائے ادب کی بیشتر زبانوں میں تراجم کی روایت موجود ہے ۔ اردو زبان کا دامن بھی ترجمے سے خالی نہیں - اردو کے ابتدائی شعری اور نثری ادب کی عمارت زیادہ تر تراجم کی بنیاد پر استوار نظر آتی ہے ۔ شاعری میں قدیم دکنی مثنویوں کا پلاٹ فارسی یا عربی سے لیا گیا ۔ نثری ادب میں ابتدائی اردو قصے بھی فارسی و عربی کی وساطت سے اردو میں آئے ۔ اردو تراجم کی روایت زیادہ قدیم نہیں ہے جس کی بنیادی وجہ خود اردو زبان کی کم عمری ہے ۔

اردو میں نثری تراجم کا آغاز سترہویں صدی کے آغاز سے ہوتا ہے ۔ عام طور پر سترہویں صدی میں ملا وجہی کی سب رس (۱۶۳۵ء) کو سب سے پہلی ترجمہ شدہ کتاب تصور کیا جاتا ہے ۔ مگر تحقیقی اعتبار سے شاہ میراں جی خدا نما (دکن) سب سے پہلے مترجم قرار پائے ہیں جن کا تعلق قطب شاہی عہد سے تھا ۔ شاہ میراں جی خدا نما نے عربی زبان کے مشہور مصنف ابوالفضائل عبداللہ بن محمد عین القضاۃ ہمدانی کی تصنیف ''تمہیدات ہمدانی'' کا اردو میں ترجمہ کیا(۱)۔ اس ترجمے کا ایک نسخہ

۱۔ جناب حامد حسن قادری مؤلف داستان تاریخ اردو ''ایڈیشن سوم'' ص۴۴ پر شاہ میراں جی خدا نما کے اس ترجمے کو شرح تمہید ہمدانی کا نام دیتے ہیں ۔ تاریخ ادب اردو جلد اول کے مصنف جناب ڈاکٹر جمیل جالبی نے جلد اول کے ص۴۹۸ پر شاہ میراں جی خدا نما کے اس ترجمے کو کسی نام سے موسوم نہیں کیا اور وضاحت کرتے ہوئے بتایا ہے کہ

rekhta

۱۶۰۳ء میں لکھا گیا(۲)۔ اس سے اس بات کا بھی پتہ چلتا ہے کہ اردو میں نثری تراجم کی روایت منظوم تراجم سے پہلے قائم ہوئی(۳)۔

شاہ میراں جی خدا نما کے بعد عہد قطب شاہی ہی سے تعلق رکھنے والے ممتاز شاعر اور نثر نگار ملا وجہی کا نام قابل ذکر ہے ۔ ملا وجہی نے شاہ جی نیشا پوری کی فارسی تصنیف دستور عشاق کا اردو میں ترجمہ ۱۶۳۵ء میں کیا جو سب رس، کے نام سے معروف ہے ۔ سب رس کے بعد اسی دور میں میراں یعقوب نے 'شمائل الاتقیاء' مصنفہ رکن عماد الدین دبیر معنوی کا اردو ترجمہ ۱۶۷۳ء میں مکمل کیا ۔ اس کتاب میں تصوف کے مسائل زیر بحث لائے گئے ہیں ۔

قطب شاہی عہد کے بعد اٹھارویں صدی عیسوی میں دکن میں مغلیہ دور حکومت میں شاہ ولی اللہ قادری نے ۱۷۰۳ء میں شیخ محمود کی

شرح تمہیدات ہمدانی ، ابو الفضائل عبداللہ کی عربی تصنیف 'تمہیدات ہمدانی' کی فارسی شرح ہے جو خواجہ بندہ نواز گیسو دراز نے ۱۴۲۱ء میں لکھی ۔ اور شاہ میراں جی خدا نما نے خواجہ بندہ نواز کی فارسی شرح کا اردو میں ترجمہ کیا ۔ علاوہ ازیں جناب حامد حسن قادری نے ابو الفضل کی عربی تصنیف کا نام 'تمہیدات عین القضاۃ' لکھا ہے جناب جمیل جالبی اسے 'تمہیدات ہمدانی' لکھتے ہیں ۔ تاہم شاہ میراں جی خدا نما کی ترجمہ شدہ کتاب کے نام میں اختلاف کے باوجود دونوں محققین میراں جی کے مترجم ہونے پر اتفاق رکھتے ہیں ۔

۲۔ داستان تاریخ اردو طبع سوم ص ۴۴ ۔

۳ ۔ ملک خشنود نے امیر خسرو کی فارسی مثنوی دہشت بہشت کا جنت سنگار کے نام سے ۱۶۴۰ء میں اردو میں منظوم ترجمہ کیا ۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ اردو کے نثری تراجم کا آغاز سترھویں صدی کے آغاز میں ہوا جبکہ منظوم تراجم کی ابتدا اسی صدی کے وسط میں ہوئی ۔ ملک خشنود کے منظوم ترجمے کے بارے میں تفصیلی معلومات کے لیے ملاحظہ ہو تاریخ ادب اردو جلد اول از ڈاکٹر جمیل جالبی صفحات ۲۵۲-۲۶۲

فارسی تصنیف ،معرفت السلوک، کا اردو میں ترجمہ کیا اس کتاب میں بھی تصوف کے مسائل بیان کیے گئے ہیں ۔ اسی دور میں سید محمد قادری کی فارسی تصنیف ،طوطی نامہ، کے اردو سمیت دیگر کئی زبانوں میں ترجمے ہوئے طوطی ۔ نامہ کو الف لیلہ اور کلیلہ و دمنہ کی طرح خاصی شہرت و مقبولیت حاصل ہوئی ہے(۴) ۔

شمالی ہند میں بھی تراجم کا کام جاری تھا فضل علی فضلی کی تصنیف 'کربل کتھا' جو ملا حسین واعظ کاشفی کی فارسی کتاب روضۃ الشہداء کا اردو ترجمہ ہے یہ ترجمہ ۱۷۳۱ء میں ہوا ۔

شمالی ہند میں اردو ترجمے کا دوسرا بڑا کام مولانا شاہ رفیع الدین اور شاہ عبدالقادر کے قرآن پاک کے اردو تراجم ہیں ۔ رفیع الدین صاحب حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے دوسرے صاحبزادے تھے انہوں نے یہ ترجمہ ۱۷۷۶ء کے قریب کیا ۔ اس ترجمے کو اہل نظر نے لفظی ، بے محاورہ اور دشوار قرار دیا ہے تاہم شاہ عبدالقادر کا ترجمہ جو ۹۵-۱ء میں ہوا اپنے پیشرو ترجمے کے مقابلے میں ادائے فہم، صفائی اور اختصار کے لحاظ سے بہتر ہے ۔

مولانا محمد غوث جو ارکاٹ کی اسلامی سلطنت کے وزیر اعظم اور اپنے زمانے کے عالم تھے ۔ آپ نے فقہ حنفی کا اردو میں ترجمہ کیا ۔ اسی طرح قاضی بدرالدولہ جو دربار ارکاٹ میں قاضی تھے اور متعدد کتابوں کے مصنف بھی آپ کا نام بھی قرآن پاک کے مترجم و مفسر کے طور پر قابل ذکر ہے یہ تراجم بھی اٹھارویں صدی کے آخر میں ہوئے ۔

کلام مجید کے ان اردو تراجم کے بعد اس زمانے کی ترجمہ شدہ مستقل کتاب میر عطا حسین تحسین کی 'نو طرز مرصع' ہے جو فارسی کے قصہ چہار درویش کا ترجمہ ہے یہ کتاب ۱۷۹۸ء میں مکمل کی گئی ۔ ترجمے میں عربی فارسی تراکیب پائی جاتی ہیں ۔ کہیں کہیں سہل اور صاف طرز اظہار بھی موجود ہے زمانی اعتبار سے اس سے پہلے دکن میں مولوی قادر علی ایک کتاب ،،مصباح الصلواۃ، کے نام سے ۱۷۸۱ء میں ترجمہ کر چکے تھے ۔

---

۴ ۔ طوطی نامہ کا خلاصہ شہنشاہ اکبر کے وزیر اعظم ابو الفضل نے بھی شہنشاہ کے حکم سے مرتب کیا تھا جس کا ایک نسخہ برٹش میوزیم لائبریری میں موجود ... تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو داستان تاریخ اردو از حامد حسن قادری صفحات ۵۰ - ۵۲

فارسی ، عربی اور سنسکرت سے اردو میں تراجم کی مذکورہ بالا کوششوں کے ساتھ ساتھ انگریزی زبان سے اردو میں ترجمے کا سراغ بھی اٹھارویں صدی عیسوی سے ملتا ہے یوں تو انگریزی سے اردو تراجم کی ابتدا اس وقت سے ہوئی جب سے انگریز قوم کا ہندوستان میں عمل دخل شروع ہوا ۔ اس ضمن میں ان عیسائی پادریوں کی کوششیں بھی قابل ذکر ہیں جنھوں نے بائبل و انجیل کے انگریزی سے دوسری زبانوں میں ترجمے کرائے اس سلسلے میں بنجمن شلز کے بائبل کے اس ترجمے کو اولیت حاصل ہے جو انہوں نے ۱۷۴۸ء میں کیا ۔

مذکورہ بالا تمام تراجم ایک طرح سے انفرادی کوششوں کی ذیل میں آتے ہیں ۔ مگر ۱۸۰۰ء میں فورٹ ولیم کالج کے قیام کے ساتھ ہی مجموعی انداز سے اردو تراجم کا باقاعدہ آغاز ہوا ۔ کالج کے پرنسپل ڈاکٹر گلکرائسٹ نے ملک بھر سے ذی علم اشخاص کو جمع کیا ان سے آسان اردو میں کتابیں لکھوائیں اور دوسری زبانوں کی شاہکار کتابوں کے ترجمے بھی اردو میں کروائے ۔ ان ادیبوں نے اس ادارے سے منسلک رہ کر فارسی ، عربی ، ہندی اور سنسکرت کی بیش بہا کتابوں کا اردو میں ترجمہ کیا ۔ ان مصنفین و مترجمین میں میرامن دہلوی ، حیدر بخش حیدری ، میر شیر علی افسوس ، میر بہادر علی حسینی ، مظہر علی خان ولا ، مرزا کاظم علی جوان، مولوی امانت اللہ شیدا، شیخ حفیظ الدین، خلیل علی خان اشک ، نہال چند لاہوری اور مرزا جان طپش وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں ۔ فورٹ ولیم کالج کے تحت جو ترجمے کیے گئے ان میں سے چند اہم قابل ذکر ترجمے درج ذیل ہیں ۔

نام اصل کتاب	ترجمہ شدہ نام	مترجم
نو طرز مرصع از عطا حسین خان تحسین	باغ و بہار	میرامن دھلوی(۵)

۵۔ ایک خیال یہ ہے کہ میرامن نے امیر خسرو کی تصنیف قصہ چہار درویش سے ترجمہ کیا ہے مگر مولوی عبدالحق نے اپنے مقدمہ باغ و بہار میں اس سے اختلاف کرتے ہوئے اسے نو طرز مرصع سے ماخوذ بتایا ہے ۔ میر امن نے تحسین کی ثقیل عبارت کو سلیس کر دیا ہے ۔ ملاحظہ ہو داستان تاریخ اردو ص ۱۰۱ ۔

مثنوی لیلہ و مجنون از امیر خسرو	قصۂ لیلہ مجنون	حیدر بخش حیدری
تاریخ جہان کشائے نادری از مرزا محمد مہدی استر آبادی	تاریخ نادری	ایضاً
بہار دانش از شیخ عنایت اللہ	گلزار دانش	ایضاً
طوطی نامہ از محمد قادری	توتا کہانی	ایضاً
ہفت سیر حاتم از حاتم طائی	آرائش محفل	ایضاً
روضۃ الشہداء ازحسین واعظ کاشفی	گل معرفت	ایضاً
گلستان سعدی از سعدی شیرازی	باغ اردو	میر شیر علی افسوس
خلاصۃ التواریخ از منشی سجان رائے	آرائش محفل	ایضاً
گلزار ابراہیم از علی ابراہیم خان	گلشن ہند	مرزا علی لطف
مفرح القلوب	اخلاق ہندی	میر بہادر علی حسینی
تاریخ آسام از شہاب الدین طالش	تاریخ آسام	ایضاً
مادھو نل اور کام کندلا از موتی رام کبشیر	مادھو نل اور کام کندلا	مظہر علی خان ولا
ہفت گلشن از ناصر علی خان واسطی	ہفت گلشن	ایضاً
بیتال پچیسی از بیتال	بیتال پچیسی	مظہر علی خان ولا
تاریخ شیر شاہی از عباس خان سروانی	تاریخ شیر شاہی	ایضاً
تزک جہانگیری	جہانگیر نامہ	ایضاً
شکنتلا از کالی داس	شکنتلا	مرزا کاظم علی جوان(۶)

۶۔ شکنتلا کے علاوہ مرزا کاظم علی نے تاریخ فرشتہ کے ایک حصے کا بھی اردو ترجمہ کیا ۔ (ن ۔ ق)

ہدایت الاسلام از امانت اللہ شیدا	ہدایت الاسلام	مولوی امانت اللہ شید
اخلاق جلالی	جامع الاخلاق	ایضاً
قرآن مجید	ترجمہ قرآن مجید	ایضاً
عیار دانش از شیخ ابو الفضل علامی	خرد افروز	شیخ حفیظ الدین
داستان امیر حمزہ	داستان امیر حمزہ	خلیل علی خان اشک
اکبر نامہ از ابو الفضل	واقعات اکبر	ایضاً
رسائل اخوان الصفا	اخوان الصفا	اکرام علی
گل بکاؤلی از عزت اللہ بنگالی	مذہب عشق	نہال چند لاہوری
تنبیہ الغافلین از مولانا شاہ رفیع الدین دہلوی	تنبیہ الغافلین	بینی نرائن جہاں(۷)
بھگوت گیتا	پریم ساگر	للو لال جی

فورٹ ولیم کالج کے مصنفین کے علاوہ بھی اس دور میں چند ایسی شخصیات موجود تھیں جنھوں نے دوسری زبانوں کے ادب کا اردو میں ترجمہ کیا ان میں سے چند قابل ذکر کتب اور ان کے مترجمین درج ذیل ہیں ۔

اصل کتاب	نام مترجم
خصوص الحکم (ابن عربی)	محمد حسین کلیم دہلوی
ترجمہ قرآن مجید	حکیم شریف خان دہلوی

۷ - تنبیہ الغافلین کے نام سے مولوی سید احمد بریلوی نے بھی ایک کتاب فارسی میں تحریر کی جس کا اردو ترجمہ مولوی عبدالحق نے کیا جو ۱۸۳۵ء ہگلی (کلکتہ) سے شائع ہوا ۔ (ن ۔ ق)

شمشیر خانی	رجب علی بیگ سرور ترجمہ بعنوان سرور سلطانی	
حدائق العشاق	ایضاً	" " گلزار سرور
الف لیلہ	ایضاً	

فورٹ ولیم کالج کے قیام سے قبل اور کالج کے عہد میں زیادہ تر عربی ، فارسی اور سنسکرت کی کتابوں کا اردو میں ترجمہ کیا گیا اور ان میں بھی اکثر مذہبی اور داستانی موضوعات منتخب کیے گئے مگر سترھویں صدی کے آخر اور اٹھارویں صدی میں انگریزی کتب کے اردو ترجمے کی کوششیں بھی نظر آتی ہیں ۔ بنجمن شلز کے بائبل کے اردو ترجمے کا ذکر پہلے آ چکا ہے ۔ فورٹ ولیم کالج کے قیام سے قبل ۱۷۹۶ء میں ڈاکٹر جان گلکرائسٹ نے انگریزی اردو لغت شائع کی ۔ انگریزی سے اردو تراجم کے سلسلے میں اٹھارویں صدی کے آخر اور انیسویں صدی کے آغاز کو بہت اہمیت حاصل ہے ۔ اس عرصے میں بہت سی انگریزی کتب کے اردو تراجم شائع ہوئے یہ تمام کوششیں تقریباً انفرادی نوعیت کی تھیں ۔ چند قابل ذکر کتب درج ذیل ہیں(۸)۔

انگریزی نام	اردو نام	مترجم	سال ترجمہ
English Dictionary	اردو لغت	کپتان ٹیلر	۱۸۰۸ء
—	لغت جہازرانی	کپتان ٹامس روبک	۱۸۱۱ء
Fables by the late Mr. Gray	احسن المواعظ	—	۱۸۳۶ء
Economics	رسالہ علم المعیشت	جان پارکس لیڈلی	۱۸۵۳ء
Readings in English Poetry	جواہر منظوم	غلام مولانا	۱۸۶۳ء

۸- انیسویں صدی کے آغاز میں بہت سی انگریزی کتب کے اردو میں نثری و منظوم ترجمے ہوئے یہ کتب اس زمانے کے نصاب کا حصہ بھی رہیں ۔ تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو، حالی کی نثر نگاری، از ڈاکٹر عبدالقیوم ۔

The Vicar of Wakefield by Gold Smith	نامعلوم	—	—
Henery and his bearer	—	نظام الدین چشتی	—
Merchant of Venice	—	ہر چند گھوش	—

اس دور میں انگریزی سے اردو میں تراجم زیادہ تر انگریز مستشرقین کی کوششوں کا نتیجہ تھے ۔ تاہم کہیں کہیں مقامی لوگوں نے بھی یہ کام کیا ۔ انگریزی سے اردو میں تراجم کی یہ کوششیں جاری تھیں کہ ۱۷۹۲ء سے قائم شدہ دہلی کالج نے انگریزی سے اردو تراجم کی کوششوں کو ایک باقاعدہ شکل دی ۔ کالج کے قیام کے تقریباً تیس برس بعد اردو ترجمے کا کام شروع ہوا اور یہ کام نہایت منظم اور باقاعدہ خطوط پر جاری ہوا اگر یہ کہا جائے کہ اردو کو اس زمانے میں علمی موضوعات سے روشناس کرانے کی پہلی باقاعدہ کوشش دہلی کالج سے شروع ہوئی تو غلط نہ ہوگا ۔ ترجمے کے اس مرکز نے مترجم کی مشکلات کو حل کرنے کی غرض سے بعض اصول پہلی دفعہ مرتب کیے ۔ دہلی کالج کا دور ۱۸۲۴ء سے ۱۸۷۷ء تک کے سالوں پر محیط ہے(۹) ۔

دہلی کالج کے بعد اردو تراجم کی روایت کو سر سید احمد خان نے باقاعدہ طور پر آگے بڑھایا مگر دور سر سید کا تفصیلی ذکر کرنے سے پہلے اس سے ذرا پہلے کے چند اردو مترجمین کا ذکر ضروری معلوم ہوتا ہے جنہوں نے اپنے اپنے طور پر مختلف زبانوں کی تخلیقات کو اردو میں منتقل کیا ۔ ان مترجمین میں سدا سکھ لال ، فقیر محمد خان گویا، نیم چند کھتری، مولوی قطب الدین، مفتی سعد اللہ ، گلشن رامپوری ، عباس بن ناصر اور منشی عبدالکریم قابل ذکر ہیں ۔

سدا سکھ لال نے زراعت سے متعلق ایک کتاب انگریزی سے اردو میں ترجمہ کی جو ۱۸۵۳ء میں چھپی ۔ فقیر محمد گویا نے ۱۸۳۵ء میں انوار سہلی

۹۔ دہلی کالج کے تراجم کی تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو مغربی تصانیف کے اردو تراجم از میر حسن خیریت آباد حیدر آباد (دکن) صفحات ۵۲-۶۵ ۔

کا ترجمہ ‹بستان حکمت› کے نام سے کیا ۔ ۱۸۳۷ء ہی میں نیم چند کھتری نے دو یادگار ترجمے کیے ۔ پہلا شمس الدین محمد دمشقی کی کتاب ‹حصین حسین› کا اردو ترجمہ ہے جس کا نام ظفر جلیل رکھا گیا ۔ دوسرے ترجمے کا نام ‹مظاہر حق› ہے جو مشکواۃ شریف کا اردو ترجمہ ہے ۔ یہ کتاب چار جلدوں میں بڑی تقطیع کے دو ہزار صفحوں پر مشتمل ہے ۔ مفتی سعد اللہ رامپوری نے چند عربی کتب کا اردو میں ترجمہ کیا ۔ ۱۸۳۰ء میں انہوں نے حضرت امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کے رسالہ فقہ اکبر کا اردو میں ترجمہ کیا ۔ منشی عبدالکریم نے ۱۸۴۷ء میں الف لیلہ کے انگریزی ترجمے کو اردو میں منتقل کیا ۔ منشی چرنجی لال نے ۱۸۵۹ء میں تعلیم النفس کے نام سے علم نفسیات سے متعلق ایک انگریزی کتاب کا اردو میں ترجمہ کیا ۱۸۹۳ء میں مولوی انشاء اللہ خان نے سلطان عبدالحمید خان ثانی کے نام سے ایک کتاب کا ترجمہ کیا ۔

اردو تراجم کے سلسلے میں سر سید احمد اور ان کے رفقاء کی کوششیں کسی طور بھی نظر انداز کیے جانے کے قابل نہیں ۔ سر سید احمد خان کی یہ دیرینہ خواہش تھی کہ مسلمان سائنس کی تعلیم میں کسی سے پیچھے نہ رہیں چنانچہ اس کے لیے ۱۸۶۲ء میں ایک سائنٹیفک سوسائٹی قائم کی گئی جس نے زیادہ تر سائنسی موضوعات مگر ساتھ ہی دیگر علوم پر مبنی انگریزی کتب کے اردو میں ترجمے کرانے اس سوسائٹی میں باقاعدہ تنخواہ دار مترجمین ملازم رکھے گئے سوسائٹی کے تحت تقریباً چالیس کتب کا ترجمہ ہوا ۔

دور سر سید ہی میں انگریزی سے اردو تراجم کی بہت سی انفرادی کوششیں بھی ہوئیں ان کتب کی تعداد تیس کے قریب ہے بحیثیت مجموعی اس دور میں جو انیسویں صدی کے نصف آخر اور بیسویں صدی کے ربع اول پر مشتمل ہے جس قدر کتب کے ترجمے چھپے ان کی تعداد اس وقت تک چھپنے والی کتب سے کہیں زیادہ تھی(۱۰) انیسویں صدی کے آخر

۱۰۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو مغربی تصانیف کے اردو تراجم صفحات ۶۶-۸۵ ۔

میں تراجم کا رخ مذہبی اور داستانوی نوعیت کی کتابوں سے ہٹ کر سائنسی، فنی اور نفسیاتی کتب کے تراجم کی طرف مڑ گیا اور فارسی و عربی کے مقابلے میں زیادہ تر انگریزی کتب کا ترجمہ کیا جانے لگا(۱۱) بیسویں صدی کے ربع اول میں "سفر دار المصطفیٰ" کے نام سے مولوی محمد انشاء اللہ ایڈیٹر اخبار وطن نے انگریزی تصنیف **Pilgrimage to Madinah and Makkah by Richard Burtan** کا اردو ترجمہ کیا۔ ۱۹۳۴ء میں فارسی تصنیف فوائد الفواد از علاؤالدین سجزی کا اردو ترجمہ غلام احمد خان نے فوائد الفواد کے نام سے ۱۹۳۴ میں کیا(۱۲)۔

۱۸۷۴ء میں مولوی محمد حسین آزاد کی تحریک اور کرنل ہالرائڈ کی تائید سے انجمن پنجاب قائم ہوئی جس کا بنیادی مقصد یہ تھا کہ مشرق شاعری کو عشق اور مبالغہ کے تسلط سے رہا کیا جائے اس مقصد کے لیے متعدد انگریزی شعراء کے منظوم اردو تراجم کیے گئے یا ان سے اخذ مطالب کر کے نظمیں کہی گئیں مگر اس کی تفصیل ہمارے موضوع سے خارج ہے۔ ۱۸۵۷ء کے بعد بیسویں صدی کے آغاز تک ڈپٹی نذیر احمد کا ترجمہ قرآن پاک، قانونی کتب کے تراجم مولانا حالی کی علم الارض (عربی سے اردو) سید علی بلگرامی کی تمدن ہند، تمدن عرب (فرانسیسی سے اردو) اور مولوی سید احمد دہلوی کی ترجمہ شدہ کتب بہت اہمیت کی حامل ہیں۔ اسی عہد میں مولانا ظفر علی خان نے بھی اردو زبان کو چند اہم اور نادر ترجموں سے نوازا۔

۱۱۔ نفسیات کی انگریزی کتب کے اردو تراجم کی تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو اردو کے ابتدائی تراجم اور نفسیات کی اصطلاح از ڈاکٹر سلیم اختر مطبوعہ صحیفہ لاہور جولائی/ستمبر ۱۹۸۳ء۔

۱۲۔ ان کتب کے تفصیلی مطالعہ کے لیے ملاحظہ ہو جناب ستار طاہر کے سلسلے وار مضامین بعنوان 'اردو میں نادر و نایاب تراجم'، مطبوعہ ماہنامہ کتاب لاہور فروری تا جون ۱۹۸۳ء۔

اس سلسلہ کی ایک اور منظم کوشش انجمن ترقی اردو ہند کی شکل میں ہمارے سامنے آتی ہے۔ انجمن ۱۹۰۳ء میں قائم ہوئی۔ سب سے پہلے مولانا شبلی نعمانی اس کے معتمد مقرر ہوئے جنھوں نے انجمن کے قیام کے اغراض و مقاصد میں نمایاں بات یہ بیان کی تھی کہ چونکہ ہر قوم کی ترقی اس پر موقوف ہے کہ علوم و فنون اس کی زبان میں آ جائیں اس لیے اردو میں علوم و فنون جدیدہ کی ضرورت ہے۔ چنانچہ اس انجمن کے تحت انگریزی و عربی کتب کے متعدد ترجمے اردو میں کیے گئے ۱۹۱۳ء میں جب مولوی عبدالحق اس کے معتمد مقرر ہوئے تو یہ انجمن پہلے سے زیادہ مستعد ہو گئی۔ ۱۹۱۳ء سے قبل انجمن ترقی اردو نے جن کتب کے ترجمے کرائے ان میں سے یہ تراجم خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ خواجہ غلام الحسنین پانی پتی نے ہربرٹ اسپنسر کی کتاب "ایجوکیشن" کا اردو ترجمہ "فلسفۂ تعلیم" کے عنوان سے کیا۔ ایبٹ کی تصنیف "نپولین بونا پارٹ" کا بھی اردو میں ترجمہ ہوا جو پانچ جلدوں میں چھپا۔ مولانا الحکیم محمد حسن فاروق نے "القول لا ظهر" کے نام سے علامہ ابن مسکویہ کی عربی تصنیف رسالہ فلسفۂ الہیات الفوز الاصغر کا اردو میں ترجمہ کیا۔

۱۹۱۳ء کے انجمن ترقی اردو نے مغربی ادب سے اردو میں جو ترجمے کرائے۔ ان میں سے چند مشہور تراجم درج ذیل ہیں۔

نام اصل کتاب	ترجمہ شدہ نام	مترجم
ہسٹری آف پرشین لٹریچر از براؤن	تاریخ ادبیات ایران (جلد اول)	سید سجاد حسین
ریپبلک (افلاطون)	ریاست	ڈاکٹر ذاکر حسین
فاؤسٹ (گوئٹے)	فاؤسٹ	ڈاکٹر سید عابد حسین
یوروپین مارلز از پروفیسر میکی	تاریخ اخلاق یورپ	مولانا عبدالماجد دریا آبادی
ہسٹری آف سویلزیشن از ٹاسس بکل	تاریخ تمدن	منشی احمد علی و عبدالماجد دریا آبادی

لائیوز آف دی ایمینٹ گریکس اینڈ رومنز از پلوٹارک	مشاہیر یونان و روما	مولوی سید ہاشمی فرید آبادی
خطبات گارساں دتاسی	—	ڈاکٹر یوسف حسن

انجمن ترقی اردو کی کوششیں اپنے طور پر جاری تھیں کہ علامہ شبلی نے ۱۹۱۳ء میں اعظم گڑھ میں "دارالمصنفین" قائم کیا جس نے مشرقی علوم و فنون کے ساتھ ساتھ مغربی فلسفیوں اور ماہرین نفسیات کی بعض اعلیٰ تصانیف کے اردو میں تراجم کرائے دارالمصنفین کے ترجموں میں روح الاجتماع ، انقلاب الامم ، مبادی علم انسانی ، مکالمات برکلے ، پیام امن ، فطرت نسوانی اور افکار عصریہ قابل ذکر ہیں ۔

۱۹۱۷ء میں جامعہ عثمانیہ کا قیام عمل میں آیا جس کے ساتھ ہی شعبہ تالیف و ترجمہ بھی وجود میں آیا ۔ جس نے ترجمے کی روایت کو اپنے انداز میں آگے بڑھایا ۔ مولوی عبدالحق اس کے ناظم مقرر ہوئے اس میں تنخواہ دار مترجمین بھرتی کیے گئے ۔ دار الترجمہ نے متعدد مغربی و مشرقی کتب کے تراجم اردو میں کرائے او رکیمیا ، طبیعیات ، حیاتیات اور انجینیئرنگ وغیرہ کے مضامین اردو ترجمے میں داخل ہوئے جو اردو زبان میں مزید توانائی اور وسعت کا وسیلہ بنے ۔ دار الترجمہ جامعہ عثمانیہ میں ترجمے کا کام فورٹ ولیم کالج ، دہلی کالج اور سائنٹیفک سوسائٹی کے مقابلے میں زیادہ بڑے پیمانے پر تھا ۔ قاضی تلمذ حسین ، قاضی محمد حسین ، ہاشمی فرید آبادی ، چوہدری برکت علی کا شمار اس ادارے کے قابل ذکر مترجمین میں ہوتا ہے ۔ دار الترجمہ کی کوششوں سے اردو میں بیشمار نئے الفاظ اور نئی اصطلاحات کا اضافہ ہوا ۔ میر حسن کے بقول :

"دار الترجمہ جامعہ عثمانیہ کا قیام اردو زبان کو علوم و فنون سے مالا مال کرنے کی پہلی باقاعدہ اور مستقل کوشش ہے جو بڑے پیمانے پر کی جا رہی ہے ۔ دار الترجمہ کی مطبوعات نے اردو میں غیر معمولی وسعت پیدا کر دی ، جدید علوم و فنون کا کافی ذخیرہ اردو میں منتقل کر دیا اور علمی خیالات کے اظہار کے لیے گنجائش پیدا کر دی ۔ اردو کے ذخیرۂ الفاظ میں

روز بروز اضافہ ہو رہا ہے"(۱۳) ۔

۱۹۲۷ء میں قائم شدہ ہندوستانی اکیڈمی اور اردو اکیڈمی نے اردو ترجمے میں اب تک کی روایت کو آگے بڑھایا ۔ ہندوستانی اکیڈمی نے جرمن ڈرامہ نویس لیسنگ کے ناول "ناتن" اور انگریزی کے ڈرامہ نگار گالزوردی کے ناول کو اردو میں منتقل کیا ۔ اردو اکیڈمی کے چند ایک اہم اور قابل ذکر ترجمے درج ذیل ہیں ۔

نام کتاب	ترجمہ شدہ نام	مترجم
لبرٹی از جان اسٹورٹ مل	آزادی	سعید انصاری بی۔ اے
ہسٹری آف ویسٹرن یورپ از ڈاکٹر رابسن	—	سید نذیر نیازی
تاریخ فلسفہ اسلام از ٹی جی بوئر	تاریخ فلسفۂ اسلام	ڈاکٹر سید عابد حسین
عربوں کا تمدن از جوزف ہیل	عربوں کا تمدن	سید نذیر نیازی
مبادی معاشیات از اسٹون کٹیبن	مبادی معاشیات	ڈاکٹر ذاکر حسین

بیسویں صدی کے اوائل میں مذکورہ بالا تنظیموں کے علاوہ انفرادی طور پر بھی اردو تراجم کا سلسلہ جاری رہا مغربی زبانوں کے ناول ، افسانہ اور ڈرامہ وغیرہ کو اردو تراجم کا جامہ پہنایا گیا ۔ اردو ترجمے کا دائرہ کار یوں وسیع ہوتا گیا کہ عربی ، فارسی ، سنسکرت اور انگریزی کے علاوہ فرانسیسی ، روسی ، ترکی اور جرمن وغیرہ کے ترجمے بھی اردو زبان میں ہونے لگے ۔ ۱۹۳۰ء کے لگ بھگ غیر ملکی افسانوی ادب کے اردو میں ترجمے ہوئے ان مترجمین میں سجاد حیدر یلدرم ، خواجہ منظور حسین ، جلیل قدوائی ، مجنوں گورکھ پوری ، ل احمد محمد مجیب ، منصور احمد ، فضل حق قریشی اور اختر حسین رائے پوری کے اسمائے گرامی قابل ذکر ہیں(۱۴) ۔

۱۳- انگریزی تصانیف کے اردو تراجم ص۱۱۷ ۔

۱۴- تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو داستان سے افسانے تک از سید وقار عظیم ۔

rekhta

۱۹۳۲-۳۳ء میں حلقۂ نیازمندان لاہور نے "رسالہ کاروان" کے ذریعے اردو ادب کے قارئین کو چند خوبصورت تراجم پڑھنے کو دیے ۔ بیسویں صدی کے ربع اول میں قیام پاکستان سے پہلے اور کچھ فوراً بعد چند مترجمین نے اپنی انفرادی کوششوں کے ذریعے غیر ملکی ادب کے اردو میں ترجمے کیے جنھیں ادبی حلقوں میں بہت سراہا گیا ۔ ان میں سید امتیاز علی تاج ، عبدالمجید سالک ، عابد علی عابد ، صوفی تبسم اور ڈاکٹر تاثیر ، مولانا صلاح الدین ، منٹو ، میراجی حسن عسکری ، اور انتظار حسین وغیرہ کی انفرادی کوششیں ناقابل فراموش ہیں ۔

قیام پاکستان کے بعد سرکاری و نیم سرکاری سطح پر ایسے ادارے قائم ہوئے جنھوں نے اپنے اپنے دائرہ کار میں تراجم کے کام کو فروغ دیا ان اداروں کی طرف سے یہ کام ہنوز جاری ہے۔ ان میں انجمن ترقی اردو پاکستان کراچی ، سائنٹفک سوسائٹی آف پاکستان کراچی ، نیشنل بک کونسل ، نیشنل بک فاؤنڈیشن ، اکادمی ادبیات ، اقبال اکادمی پاکستان لاہور ، مجلس زبان دفتری پنجاب لاہور، ادارہ تالیف و ترجمہ جامعہ پنجاب لاہور، شعبہ تصنیف و تالیف و ترجمہ جامعہ کراچی ، مرکزی اردو بورڈ اور مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد نمایاں ہیں ۔

قیام پاکستان کے بعد علاقائی ادب کے اردو میں تراجم کا کام بھی شروع ہوا جس کے تحت خوشحال خان خٹک ، بابا بلھے شاہ ، خواجہ فرید ، عبداللطیف بھٹائی ، عزیز بگٹی اور دیگر نثر نگاروں کی تخلیقات کا اردو میں ترجمہ ہوا ۔ یہ سلسلہ ابھی جاری ہے اور ہر ایک صوبے میں قائم شدہ ادبی اکیڈمیاں علاقائی ادب کو ترجمے کے ذریعے اردو میں منتقل کرنے میں مصروف ہیں ۔

ترجمے کی ضرورت و اہمیت

rekhta

ترجمے کی ضرورت[۱]

'ترجمے کی ضرورت'۔ اس موضوع کے ساتھ ہی میرا ذہن شاہ عبدالقادر کے ترجمے کی طرف منتقل ہو جاتا ہے ۔ اور جو سوال اُٹھتا ہے یہ ہے کہ شاہ عبدالقادر کو قرآن کریم اردو میں ترجمہ کرنے کی کیوں ضرورت پڑی تھی ۔ بات شاہ عبدالقادر ہی پر ختم نہیں ہوتی ۔ اُن سے پہلے یورپی مشنریوں نے بائبل کا اُردو میں ترجمہ کیا تھا ۔ اور کچھ یوں لگتا ہے 'اور حقیقت بھی یہی ہے کہ عیسائی مشنریوں اور شاہ عبدالقادر ، دونوں کا ترجمے کے بارے میں مقصد اور نقطہ نظر یکساں تھا اور وہ ایک عام آدمی تک خدا کی بھیجی ہوئی کتاب کے مفہوم اور پیغام کا پہنچانا تھا ۔ جسے بعض مشکلات کے باعث عام آدمی جاننے اور جان کر محسوس کرنے سے قاصر تھا ۔ کیوں کہ قرآن کریم کی زبان عربی تھی (اور ہے) اور وہ بائبل جسے یورپی مشنری ترجمہ کرکے پھیلانا چاہتے تھے بعض اوقات لج زبان اور عموماً انگریزی میں دستیاب ہوتی تھی ۔ ترجمے کی ایسی ضرورت جو اس ضمن میں نظر آتی ہے خالصتاً مذہبی تقاضوں سے پیدا ہوتی ہے اور پیغام الٰہی کی نشر و اشاعت کا ذمہ لیتی ہے ۔ لیکن جب ہم تاریخ کی کتابوں میں عباسیوں کے زمانے کے تراجم کا ذکر پڑھتے ہیں اور پتہ چلتا ہے کہ سریانی ، یونانی اور سنسکرت زبانوں کا علم اور فلسفہ عربی زبان میں منتقل ہوا تھا تو پھر وہی سوال اُٹھتا ہے کہ عباسی دور کے عالموں کو پرانی کتابوں اور علوم کو عربی میں ترجمہ کرنے کی ضرورت کیوں پڑی تھی ۔ اور یہی سوال اُن کتابوں کے بارے میں بھی اُٹھتا ہے جنھیں مغلیہ دور کے عالم فارسی میں

۱۔ مشمولہ تنقید کا نیا پس منظر از جیلانی کامران مکتبہ ادب جدید ۔ ۱۵ پٹیالہ گراؤنڈ لاہور نومبر ۱۹۶۰ء صفحات ۶۱-۶۸ ۔

ترجمہ کرتے تھے ۔ ترجمے کی ایسی ضرورت خالصتاً علمی تقاضوں سے پیدا ہوتی ہے اور انسانی ذہن کی نشو و نما کا باعث بنتی ہے ۔

اس صداقت کو سب مانتے ہیں کہ ترجمے کا عمل اُس وقت تک کارآمد نہیں ہو سکتا جب تک کہ مقابلے میں کوئی دوسری زبان نہ ہو ۔ ایک ایسے علاقے میں جہاں لوگ ایک لسانی وحدت ہوں وہاں ترجمے کا سوال ہی پیدا نہیں ہو سکتا ۔ لہذا جب تک دو لسانی وحدتیں باہم سامنے نہ ہوں اور دونوں کے درمیان رابطہ نہ ہو ، ترجمے کا عمل ظاہر نہیں ہو سکتا ۔ لیکن یہ بات بھی درست ہے کہ زبانیں ، لفظوں سے مل کر اور لفظوں کے مجموعے سے بنتی ہیں ۔ اور غالباً کوئی بھی لفظ ایسا نہیں ہے جس کا مطلب یا معنی نہ ہو ۔ اس لیے جب دو لسانی وحدتیں باہم عمل پیرا ہوتی ہیں ۔ تو نہ صرف متاثر ہونے والی زبان کے الفاظ ہی اس عمل میں شریک ہوتے ہیں بلکہ اُس زبان اور لسانی وحدت کے معانی بھی دوسری زبان میں منتقل ہونے لگتے ہیں ۔ ایک سطح پر ترجمے کا عمل متاثر ہونے والی زبان کے ذخیروں کو آزماتا ہے ۔ اور دوسری سطح پر اُس لسانی وحدت کے علمی اور ثقافتی تصورات میں اضافہ بھی کرتا ہے ۔ اس طرح ترجمے کے عمل کے ساتھ قوموں کی علمی تاریخ پھیلتی اور بڑھتی ہے ۔ اور ان کی زبانیں اُس علمی تاریخ کو محفوظ کرتے ہوئے وہ تمام منزلیں بھی طے کرتی ہیں جنھیں ہم بچپن ، بلوغت اور جوانی کے ناموں سے پکارتے ہیں ۔ اور جب زبانیں پختہ ہو جاتی ہیں اُس وقت وہ اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر ذہنی اور علمی پختگی کو قائم کرنے میں معاون بھی ثابت ہوتی ہیں ۔

ترجمے کے عمل کو پیش نظر رکھتے ہوئے ایک عجیب بات دکھائی دیتی ہے ۔ اور وہ یہ ہے کہ غیر ادبی تصانیف کا ترجمہ دراصل ایک زبان کی لسانی موت سے پیدا ہوتا ہے اور دوسری زبان کی لسانی افزائش کا باعث بنتا ہے ۔ ''لسانی موت'' کی ترکیب قابل غور ہے ۔ میں نے اسے استعارۃً استعمال کیا ہے ۔ کیوں کہ ہم جس زبان سے ترجمہ کرتے ہیں اُس کے الفاظ ہمیں عزیز نہیں ہوتے ۔ اور نہ ہمیں اُس کی لسانی خوبیوں سے کوئی تعلق

rekhta

ہوتا ہے ۔ ہمیں لفظوں کی شکل و صورت ، اُن کے تلفظ ، اور اُن کے حسن اور موسیقی سے کوئی دل چسپی نہیں ہوتی ۔ دل چسپی ہوتی ہے تو صرف اُس شے سے جو لفظوں کا لباس پہنے لفظوں کے پرے کسی طلسمی راز کے طور پر موجود ہوتی ہے ۔ ہم اُسے برآمد کرنے اور اپنی زبان میں کامیابی اور ایمان داری سے منتقل کرنے کے لیے الفاظ کے سب ناطے اور اصل زبان کے سلسلے فراموش کر دیتے ہیں ۔ اور یوں سمجھتے ہیں کہ اصل زبان مر چکی ہے اور ہم اُس کے جادو سے اپنی زبان کو زندہ کرنا چاہتے ہیں۔۔۔ایک زمانہ تھا جب یورپ کے لوگ ارسطو اور افلاطون کو اصل یونانی میں پڑھتے تھے لیکن ترجمے کے ساتھ ہی ارسطو اور افلاطون یورپی قومی زبانوں میں دوبارہ جی اُٹھتے ہیں ۔ اور کوئی شخص ایسا نہیں ہے جو ارسطو کی شعریت پڑھنے کے لیے اصل یونانی کی طرف جاتا ہو ۔ سب کے سب جب ارسطو کا نام سنتے ہیں ، بوچر اور انگرم بائیواٹر ہی تک پہنچتے ہیں ۔ اور یہاں جس ارسطو سے متعارف ہوتے ہیں وہ زندہ ارسطو ہے جو یونانی زبان کے ارسطو کی وفات سے رونما ہوا ہے ۔ اس حقیقت کو مد نظر رکھتے ہوئے جب ہم ترجمے کی ضرورت پر غور کرتے ہیں تو محسوس ہوتا ہے کہ ہم ترجمے کے عمل کے ذریعے ان زبانوں کی علمی برتری کو ختم کرنا چاہتے ہیں جن کی علمی برتری ہمیں پریشان کرتی ہے ۔ اور اس طرح اپنی زبان کو وہی قامت ، گہرائی اور پھیلاؤ دینا چاہتے ہیں جو یورپ کی قومی زبانوں کو آج حاصل ہے لیکن کچھ صدیاں پہلے وہی فضیلت لاطینی اور یونانی کو حاصل تھی ۔

غالباً ہر زبان علمی تحقیق کے فرائض کو سر انجام دیتے ہوئے گھبراتی ہے کیوں کہ زبانیں ، قوموں اور اشخاص کی طرح اس دور میں ابتدائی تربیت حاصل کرتی ہیں ۔ جس دور میں لوگ شعر کہتے ہیں اور ان کے عالم شعری طرز کا فلسفہ اور علم دریافت کرتے ہیں ۔ جس طرح بچپن اور جوانی کے بعد انسانی زندگی میں پختگی کا دور آتا ہے اور قومیں تصورات اور علمی تحقیق کی طرف رجوع کرتی ہیں ۔ اسی طرح زبانیں بھی شعری دور سے باہر نکل کر سائنسی دور میں داخل ہوتی ہیں ۔ اور مناسب تربیت نہ ہونے کی

وجہ سے سائنسی اور فلسفیانہ ذمہ داریوں کو نبھانے میں ہچکچاہٹ اور گھبراہٹ محسوس کرتی ہیں ۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ نئی ظاہر ہونے والی زبانوں کی تربیت کے کون سے طریقے ہیں ؟ اور ان کی گھبراہٹ کو کس طریقے سے دور کیا جا سکتا ہے ؟ ان سوالوں کا جواب ترجمہ ہے ۔ ترجمے کے ذریعے زبانیں تجربہ اور اعتماد حاصل کرتی ہیں ۔ اور کسی بڑی اور وسیع زبان کو اپنے قالب میں سمو کر وہ یقین اور خود اعتمادی پا لیتی ہیں جو ترجمے کی مشق اور کوشش ، تربیت اور کامیابی کا واضح نتیجہ ہیں ۔

ترجمے کے ذریعے زبان کئی طرح پھلتی اور پھولتی ہے ۔ اور اس کی کئی طرح کی خوبیاں ترجمے کے مضامین کے حوالے سے پیدا ہوتی ہیں ۔ وہ ایک وقت میں علم الشعر کو بیان کر سکتی ہے ۔ اور دوسرے وقت میں وہی زبان فلسفے کی زبان بھی بن سکتی ہے ۔ اسی زبان میں طب کی باتیں کی جا سکتی ہیں ۔ اور وہی زبان ٹریننگ کے اصولوں کی ، بچوں کی نظموں اور قانون کی زبان بھی بن سکتی ہے ۔ لوگ اسی کے ذریعے ریاضی کے مسائل حل کرتے ہیں ۔ اور سائنس کے طالب علم ٹھوس ، مائع اور گیس کی باتیں کرتے ہیں۔ نفسیات، عمرانیات، اکنامکس ، تاریخ اور دقیق علمی مسائل بھی زبان ہی کے ذریعے بیان کیے جاتے ہیں ۔ لیکن شرط زبان کے تجربے اور تربیت کی ہے ۔ اگر زبان میں خود اعتمادی ہے اور اسے مناسب مشق حاصل ہے ۔ تو کوئی بھی موضوع ایسا نہیں ہے جسے وہ بیان نہ کر سکتی ہو اور اپنی لپیٹ میں لے لینے سے قاصر ہو ۔

یہ تو وہ باتیں ہیں جو ایک دوسری زبان کے قالب میں موجود رہنے والے تصورات سے تعلق رکھتی ہیں ۔ یعنی ایسی چیزیں ہیں جنھیں لفظوں کے پردے سے باہر نکالا جا سکتا ہے اور اصل لفظوں کے حوالے کے بغیر استعمال کیا جا سکتا ہے ۔ دوسرے لفظوں میں ایسی صورت حال میں الفاظ کی خوب صورتی اور زبان کی جمالیاتی اور فنی خوبیوں پر زور نہیں دیا جاتا ۔ ترجمے کا عمل ، اس حالت میں ، صرف علمی اثاثے کی نشوونما میں حصہ لیتا ہے ۔

ترجمہ جہاں الفاظ کے ذریعے انسانی علوم میں اضافہ کرتا ہے اور ذہن کی سرحدوں کو کشادہ کرنے میں مدد دیتا ہے اور اس میں ترجمے کی تمدنی اور ثقافتی ضرورت بھی مضمر ہوتی ہے ، وہاں ترجمے کا عمل زبان کی ساخت کو بھی متاثر کرتا ہے ۔ خیالات اور جذبات کو بیان کرنے کے لئے نئے اسلوب مل جاتے ہیں ۔ نئے الفاظ وضع کرنا پڑتے ہیں ۔ پرانے الفاظ کو دوبارہ استعمال کرنے سے ان میں وسعت پیدا ہوتی ہے ۔ نئے محاورے اور نئے محرکات دستیاب ہوتے ہیں ۔ اور نئے علوم سے آشنائی ہوتی ہے ۔ علاوہ ازیں نئی نئی اصناف کے ساتھ ذہن کا تعارف ہوتا ہے ۔ اور فکر اور تحقیق کے لیے نئے سانچے ، اور نئے اسالیب مل جاتے ہیں ۔

یہ بات مجھے زبان کے مزاج کی طرف لے جاتی ہے ۔ بعض زبانیں کرخت اور سنگلاخ ہوتی ہیں جن میں میٹھی اور دل کش باتوں کو بیان کرنے کی صفت نہیں ہوتی۔ وہ اپنے مزاج کے مطابق بولی جا سکتی ہیں۔ اور ان کا مزاج ایک ہی سطح پر کارآمد ہوتا ہے ۔ ایسی زبان ایک مخصوص طرز کی شاعری پیدا کر سکتی ہے ۔ اور جس جذبے کو صورت دینے کے قابل ہوتی ہے وہ اسی مزاج ہی کے مطابق ہوتا ہے ۔ کچھ ایسی حالت انگریزی زبان کی تھی جب بائبل کا ابھی اس زبان میں ترجمہ نہیں ہوا تھا ۔ سٹائل کے لحاظ سے انگریزی نثر رومی انشا پردازوں کے زیر اثر تھی ۔ اور پرانی انگریزی کا اسلوب کہانیوں ہی کے لیے کارآمد سمجھا جاتا تھا ۔ ادبی طرز کا ایک اسلوب شان و شکوہ کا تھا ۔ لمبے بلند آہنگ جملے ، قواعد اور علمیت کے مظاہرے اس طرز کے اسلوب سے پیدا ہوتے تھے ۔ اس اسلوب میں رومی قیصر کا دبدبہ تھا مگر دل کی آگ نہ تھی ۔ مگر دوسری طرح کا سٹائل شان و شکوہ سے کہیں زیادہ متانت اور سلامت کا سٹائل تھا ۔ جس کے فقرے مختصر اور جچے تلے ہوتے تھے ۔ تیسری طرز کا سٹائل پرانی انگریزی نثر کا سٹائل تھا ۔ جسے گو لاطینی کے انشا پردازوں کی حمایت حاصل نہ تھی مگر گرجا کے عہدیدار اسے استعمال کرنے کے عادی تھے ۔ احیائے علوم کی تحریک سے پہلے اسے مذہبی لیکچروں میں استعمال کیا جاتا

تھا ۔ یہ اسلوب شعری طبیعت کا اسلوب تھا اور اس میں سیدھی سادی باتیں کہی جا سکتی تھیں ۔ لیکن اس میں گہرائی نہ تھی ۔

اسی صورت حال کو یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ احیائے علوم کی تحریک کے زمانے کی انگریزی نثر رومی اور قدیم انگریزی اجزا سے مل کر بنتی تھی ۔ لیکن انگریزوں کی ثقافتی اور فکری شخصیت خالصتاً ان اجزا کے مجموعے سے مرتب نہ ہوتی تھی ۔ عبرانی اجزا بھی اسی شخصیت کا حصہ تھے مگر ابھی تک نثر میں نمودار نہ ہوئے تھے ۔ بائبل کا انگریزی میں ترجمہ دراصل انگریزی نثر میں عبرانی اجزا کی شمولیت کا واقعہ ہے ۔ عبرانی جملے کی شکل ، قدیم انگریزی اور رومن جملے کی شکل سے مختلف تھی ۔ عبرانی کا ایک جملہ ، ایک ہی وقت میں تکرار اور مکرر تکرار کے ساتھ جملے کی واقعیت کو شاعری کی سرحدوں میں پھیلا دیتا تھا ۔ اور جملے کا مفہوم عالم گیر خصائص اختیار کر لیتا تھا ۔ نثر مختلف استعاروں کی مدد سے ایک ایسا شعری تجربہ پیش کرتی تھی جو پیدا تو جسم اور حواس کے جغرافیے سے ہوتا تھا مگر پیدا ہوتے ہی غیر مرئی اور غیر مادی شکل اختیار کر لیتا تھا ۔ ان باتوں کے علاوہ بائبل کا مزاج شمالی یورپ اور قدیم اٹلی کے مزاج سے مختلف تھا ۔ اس کے جذبات کا رنگ گہرا اور اس کی تاثیر فوری تھی۔بائبل کی نثر شاعرانہ تھی ، جو قدیم انگریزی اور رومن نثر سے مختلف تھی ۔

انگریزی نثر کی خوب صورتی جس میں کلیسا کے بڑے عہدیدار ، سیاسی زندگی کے مقرر اور کارلائل شامل ہیں ، اسی عبرانی انداز کی بدولت ہے ۔ مگر بائبل کا ذکر کرنے سے میرا مقصد ترجمے کی اس خوبی سے ہے جو ترجمہ کرنے سے کسی زبان میں پیدا ہوتی ہے ۔ دوسری زبان کے جملے کی ساخت ، اس کی تشبیہیں اور استعارے ، اسی زبان کا سوز ، یہ باتیں مل کر اثر قبول کرنے والی زبان کی صلاحیتوں کو اجاگر کرتی ہیں۔ اور اسے وہ رنگ دیتی ہیں جو پہلے اس کے پاس نہیں ہوتا ۔ کچھ یہی باتیں جو انجیل کے ترجمے سے متعلق ہیں ۔ شاہ عبدالقادر کے ترجمے پر بھی ٹھیک بیٹھتی ہیں ۔ اردو زبان ، جو آج ہر لحاظ سے ہمارے کلچر اور علوم کی زبان ہے ایسی عظمت

اور وسعت حاصل نہ کر سکتی اگر اسے فورٹ ولیم کالج ، برٹش اینڈ فارن بائبل سوسائٹی ، اور شاہ عبدالقادر کے ترجمے کی حمایت حاصل نہ ہوتی ۔ اگر ہم اُردو شاعری کی زبان کا مقابلہ شاہ عبدالقادر کے ترجمے کی نثر سے کریں تو ہمیں ترجمے کی خوب صورتی اور تاثیر واضح طور پر نظر آئے گی ۔ اس سے میرا مطلب یہ نہیں ہے کہ جو عظمت اور کلاسیکی شوکت اصل عربی میں ہے وہی ترجمے کی اردو میں ہے ۔ فرق تو ضرور ہے لیکن یہ کوئی کم فخر کی بات نہیں ہے کہ اس زمانے کی اردو نے عربی کے وسیع مفہوم اور معانی کے سمندر کو اپنے کمزور اور شرمیلے قالب میں سمیٹنے کی کوشش کی تھی ۔ اور اس میں کامیاب ہوئی تھی ۔ تاہم یہ بتانے کے لیے کہ ایک زبان دوسری زبان کے محاورے کو اپنے طور اور طریق پر کس طرح ڈھالتی ہے میں سورہ قیامت کی چند آیات کا ترجمہ نقل کرتا ہوں :

> "قسم کھاتا ہوں قیامت کے دن کی اور قسم کھاتا ہوں جی کی جو اُلہنا دیتا ہے ۔ کیا خیال رکھتا ہے آدمی کہ ہم جمع نہ کریں گے اُس کی ہڈیاں ، کیوں نہیں۔ سکتے ہیں ہم ، پوچھتا ہے کب ہے دن قیامت کا ۔ پھر جب چندلانے لگے تیور ، اور گہہ جاوے چاند اور اکٹھے ہوں سورج اور چاند ، کہے گا اس دن آدمی ، کہاں جاؤں بھاگ کر کوئی نہیں ، کہیں نہیں بچاؤ ۔ پھر مقرر ہمارے ذمہ ہے اس کو کھول بتانا ، کوئی نہیں ۔ پر تم چاہتے ہو شتاب ملنے کو اور چھوڑتے ہو دور آنے کو ، کتنے منہ اس دن تازے ہیں ، اپنے رب کی طرف دیکھتے ۔ اور کتنے منہ اس دن اداس ہیں ، خیال میں ہیں کہ ان پر ہووے جس سے کمر ٹوٹے ، کوئی نہیں—خرابی تیری تس پر پھر خرابی تیری ، خرابی پر خرابی تیری ۔ کیا خیال رکھتا ہے آدمی کہ چھوٹا رہے گا بے قید !"

(شاہ عبدالقادر کا ترجمہ ، الہ آباد مشن پریس ۱۸۴۴ء)

اس ترجمے کی انفرادیت جملے میں الفاظ کی مخصوص نشست سے پیدا ہوتی ہے ۔ الفاظ اپنی نشست اپنے اصل عربی متن سے اخذ کرتے ہیں ۔ اور اس طرح عربی گرامر اور اردو گرامر کے اتصال سے جو جملہ رونما ہوتا ہے وہ اس ترجمے کا جملہ بن جاتا ہے ۔ اسی ترجمے کو دیکھتے ہوئے معلوم ہوتا ہے کہ ترجمہ کرتے وقت مترجم نے عالمانہ زبان کو اپنے اوپر وارد نہیں ہونے دیا ۔ اور ہم یہ بھی نہیں کہہ سکتے کہ شاہ عبدالقادر فارسی انشا پردازی سے نا واقف تھے ۔ انھوں نے ترجمے کے لیے اس زبان کو استعمال کیا جو لوگ بولتے تھے اور جس کی لغت غیر فہم نہ تھی ۔ ایسے مواد کے ساتھ شاہ عبدالقادر نے اردو نثر کو جو اعتماد اور یقین مہیا کیا وہ ہر لحاظ سے قابل تعریف ہے ۔ حیرت کی بات ہے کہ سلاست اور بے ساختگی کی جو روایت اس ترجمے کے ذریعے قائم ہوئی تھی اسے مناسب شہرت نہیں دی گئی ۔ اور اردو زبان کی ان صلاحیتوں کو استعمال نہیں کیا گیا جو شاہ عبدالقادر کے ترجمے کے ذریعے ظاہر ہوتی ہیں ۔

مجھے بخوبی احساس ہے کہ میرا موضوع ترجمے کی ضرورت ہے ۔ اور میں نے "ضرورت" کی ذیل میں بہت سی ایسی باتیں کہی ہیں جو سرسری طور پر ترجمے کی ضرورت پر غالباً بہت کم روشنی ڈالتی ہیں ۔ لیکن کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ ترجمے کی ضرورت علم اور زبان کی افزائش سے تعلق رکھتی ہے ۔ اور ہم نہ صرف زبان کی وسعت چاہتے ہیں بلکہ ذہن کی وسعت بھی ہمارے سامنے ہوتی ہے جب ہم ترجمے کا ذکر کرتے ہیں—ترجمہ اصل میں دو زبانوں اور دو تہذیبوں کے مابین پل کا کام دیتا ہے ۔ جس کے ذریعے خیالات اور تصورات ایک تہذیب سے دوسری کی طرف ، اور ایک ملک سے دوسرے ملک کی جانب جاتے ہیں ۔ اور اس سارے عمل میں درآمد اور برآمد دونوں کیفیتیں شامل ہوتی ہیں ۔ ایک طرف کے تصورات دوسری طرف اور دوسری طرف کے اس جانب آتے ہیں ۔ لیکن میرا مضمون برآمد کی کیفیت کو اپنی فہرست میں شامل نہیں کرتا ۔ اگر ایسی بات ہوتی تو میں

rekhta

پروفیسر آربری ، وکٹر کیرنین ، اور صوفی اے ۔ کیو ۔ نیاز کا ذکر کرتا ۔ ترجمے کی ضرورت ہمارے قومی مقاصد کے تابع ہے ۔ اور درآمد کے اصولوں کو پورا کرتی ہے ۔ جس طرح ہم دساور سے مشینیں منگواتے ہیں تاکہ کارخانے قائم کریں اور اس طرح ملک کے معیار زندگی کو بلند کریں ۔ اس طرح دساور سے کتابیں منگوا کر اس ملک میں تصورات اور سائنسی تعلیم کو علمی فضا کا حصہ بنانا چاہتے ہیں تاکہ دنیا کی تہذیب کا تندرست اور قیمتی سرمایہ ہماری زبان میں شامل ہو کر ہماری تعلیم کا حصہ بن جائے اور ہم اپنی سوچ بچار کے علاقے وسیع سے وسیع تر کر سکیں ۔

لیکن ایسی ضرورت سراسر افادی ہے ۔ ترجمے کی ضرورت تہذیبی نشو و نما کے لیے بھی لازمی ہے ۔ کیوں کہ تہذیبیں ایک عرصے کے بعد اپنے سر چشموں کو خشک کر دیتی ہیں ۔ اور اپنے آپ میں سے پھر کوئی نئی شے پیدا نہیں کر سکتیں ۔ اس طرح وہ ذہنی علیحدگی اور یک طرفہ تہذیبی تعصب کا شکار ہو جاتی ہیں اس بیماری کو ترجمے کا عمل دور کرتا ہے ۔ اور قومیں اور تہذیبیں ، مسافت اور جغرافیے کی دقتوں کے باوجود ایک دوسرے سے آشنا ہوتی ہیں ۔ اور انسانوں کے گروہ مختلف دوسرے گروہوں کو پہچاننے لگتے ہیں ۔ اور انسانی برادری کا چہرہ نظر آنے لگتا ہے جس کی جانب انسان ہمیشہ سے سفر کر رہا ہے ۔ کئی ایک دوسری سرگرمیوں کی طرح ترجمے کا عمل بھی انسان کو انسان کے قریب تر لاتا ہے ۔ اور ذہن کی سرحدیں پھیلاتے ہوئے کہتا ہے—زبانیں مختلف سہی ، ملک دور دور سہی ، مگر انسان ایک غیر منقسم صداقت ہے !

ترجمے کی ضرورت[۱]

آج کل ضرورتوں کا سیلاب امڈ آیا ہے ، جدھر اور جہاں نگاہ جاتی ہے ضرورتوں کا بھوت منہ چڑاتا ہے ، جب چاروں طرف دل لبھانے اور ترسانے والی ضرورتوں کا حصار ہو ، کونسی ضرورت غلبہ پاتی ہے ، اس کا دارومدار مغلوب ہونے والے پر ہے کہ وہ کس ضرورت کو اولیت کا درجہ دیتا ہے ۔ ضرورت موجود میں غیر موجود کی تلاش یا موجود کے حصول کی خواہش سے پیدا ہوتی ہے ۔ ضرورت اور ضرورت مند کے مابین بعد کا قیام لازمی ہے ، ورنہ حصول یا تکمیل ، ضرورت کے وجود کو ختم کر دیتے ہیں ۔ ضرورتوں میں حفظ مراتب ، تقدیم و تاخیر کا مدار ، نقطۂ نظر زندگی کے مختلف مظاہر سے متعلق رویوں کی اجتماعی ہیئت سے عنوان پاتا ہے ۔ چنانچہ زندگی میں ایک ضرورت کا انتخاب دیگر شعبہ ہائے زندگی کی ضرورتوں کی نشاندہی بھی کرتا ہے ۔ اطمینان نئی ضرورت کی سرگوشی ہے ۔

آج کل ضرورتوں کا سیلاب امڈ آیا ہے ، چھوٹی چھوٹی انفرادی ضرورتوں کے غلبے نے اجتماعی ضرورتوں کے تصور کو محو کر دیا ہے ، نتیجہ خود مرکزیت ، یہ معروضیت کا انہدام ہے ! موضوع سے معروض کا سفر کسی صورت حال یا شے کو اپنے آپ سے علیحدہ کر کے دیکھنے کا عمل ہے جس میں ذات ایک حوالہ بن کر اپنے سے باہر ایک وسیع تر وجود میں شرکت پر آمادہ کرتی ہے ۔ ایسی معروضیت کی عدم موجودگی نے جہاں ہمارے معاشرے میں بہت سے مسائل پیدا کر دیے ہیں ، وہاں ہماری فکری زندگی بھی عجیب کسمپرسی کی حالت میں ہے ۔

ہمارے معاشرے میں سوچ کے دھارے روز بروز خشک ہوتے جا رہے ہیں ۔ دوسرے محرکات کے علاوہ ، اہم اور غیر اہم ضروریات کی افراط تفریط

۱۔ مشمولہ تصورات از انیس ناگی شائع کردہ ص ن ۔ پبلی کیشنز لاہور (س ۔ ن) صفحات ۵۸-۶۸ ۔

میں انتخاب کی عدم صحت نے اس صورت حال کو زیادہ تشویشناک بنا دیا ہے ، سوچ کے سوتے اگر ایک طرف معاشرتی عمل اور تعمل سے جنم لیتے ہیں تو دوسری طرف علم و ادب کے میدان میں بھر پور تخلیقی عمل سے وجود اختیار کرتے ہیں ۔ لیکن تخلیقی میدان میں بوی یہی مشکل در پیش ہے کہ یہاں بھی دوسرے شعبہ ہائے زندگی کی طرح ابتری اور خود مرکزیت ہے ۔ اول تو ادیب حقیقی تخلیق سے گریز کر رہا ہے اور اگر تخلیق کرتا ہوی ہے تو اس کا روئے سخن اپنے زمانے سے نہیں ہے ۔ اس وقت جب کہ اجتماعی طور پر ہم کسی دستور العمل یا نظریے کی تائید پر آمادہ نہیں ہیں ، اس وقت جب کہ ہم نے غیر اہم ضروریات کو اس قدر اہم بنا دیا ہے کہ ہمیں چھوٹی چھوٹی منفعتوں کے بجز اور کچھ نظر نہیں آتا ، لفظ کا بے اثر اور بے حرمت ہو جانا کوئی بڑی بات نہیں ہے ، اس بے حس صورت حال کے حصار کو ہر قسم کی رکاوٹوں اور دل شکن بندشوں کے باوجود ، خواہ وہ ناشروں کی طرف سے ہوں یا کسی اور ادارے کی جانب سے، ہم تخلیقی عمل کے ذریعے توڑا جا سکتا ہے ایک خاص قسم کی ذہنی اور جذباتی فضا کے ذریعے نظریات کو فروغ دیا جا سکتا ہے ۔ خصوصاً ایسے نظریات کو جو اجتماعی قلب ماہیئت کا یارا رکھتے ہوں ، جو زندگی کی نئی عقلی اور جذباتی بنیادوں پر ابھارنے کی صلاحیت کے حامل ہوں ، لیکن یہ تب ممکن ہو گا اگر ہم اپنے معروضی وجود سے غافل رہنا پسند نہ کریں ۔

اس صورت حال میں جب تخلیقی عمل سست روی کا شکار ہو ، اور نئے نظریات اور جذباتی پیراؤں کی تشکیل و تدوین کی اہلیت کسی قدر سلب ہو چکی ہو تو اس وقت خیالات کی ترویج اور نظریات کی تشکیل غیر ملکی ادب ، فکر اور دیگر شعبہ ہائے تخلیقات کے ذریعہ متواتر تراجم کی ضرورت نہ صرف ایک اجتماعی تقاضے کی سطح پر ابھرتی ہے ۔ بلکہ ادبی اور علمی سطح پر بھی ناگزیر ہو جاتی ہے کیونکہ تصوراتی اور فکریاتی سطح پر اس جمود کو ختم کرنے کا ایک ذریعہ تصوراتی اور جذباتی رویوں کا ایک زبان سے دوسری زبان میں انتقال ہے ۔ غیر ملکی ادب ، فنون اور سائنسی علوم

کے تراجم کے سلسلے میں سب سے اہم ضرورت اپنی ضروریات کا احساس ہے کہ ہم کس قسم کے نظریات ، ادبی لہجے اور فکری پیرائے کی ترویج یا احیا چاہتے ہیں ؟ کیا ہمیں واقعی ایسے تراجم کی ترویج سے گریز کرنا چاہیے جن کی غیر ملکی طاقتیں مخصوص عزائم کے پیش نظر سرپرستی کا وعدہ کرتی ہیں ؟ کھری بات تو یہ ہے کہ ذہنوں کی تبدیلی ، فکر کی نشو و نما اور تہذیبی سانچوں کی پرورش کے لیے ایسے تصورات کے فروغ کی ضرورت ہے جو علمی و ادبی سطح پر نہ صرف ایک وسیع تناظر مہیا کرکے اشیاء ، موجود اور وقائع کی تصریح میں تغیر یا اضافے کی ضامن ہوں بلکہ ایک مخصوص زمانی سیاق و سباق میں پیدا شدہ تضادات اور مسائل کے تجزیہ ، تردید یا ایجاب کا قرینہ بھی مرتب کریں ۔ ثقافتی سطح پر ترجمہ دو مختلف تہذیبوں کے مخصوص رویوں کے رو برو ہونے کا عمل ہے ، بلکہ یہ ایک تہذیبی مزاج کا اور دوسری تہذیبی شخصیت کا تعارف ہے ، یورپی اور مغربی زبانوں کے برعکس بیشتر مشرقی زبانیں اور خصوصاً اردو زبانوں کے حوالے سے تنہائی کا شکار ہے اور اس تنہائی نے اس شخصیت کے خطوط کو اتنا بھدا کر دیا ہے کہ وہ ارتباط سے عموماً گریز کرتی ہے اسے اپنے علاوہ ہر دوسرا اوپرا نظر آتا ہے ، غالباً یہی وجہ ہے کہ ابھی تک اُردو زبان میں ہر طرح کے موضوعات و مضامین کی ادائیگی کی صلاحیت بہت کم ہے ۔ جب بھی فلسفہ ، نفسیات یا سائنسی علوم پر کچھ لکھنے کی نوبت آتی ہے تو ذہن قدیم فارسی ، عربی ، یا بعض اوقات ہندی اصطلاحات کا تعاقب کرتا ہے ، نتیجہ اس کا ظاہر ہے ، اپنی مکمل شکل میں تحریر ایسے ادق الفاظ کا مجموعہ بن جاتی ہے کہ مافی الضمیر اوجھل ہو جاتا ہے ۔ ایسی صورت میں کچھ تو مناسب الفاظ کی کمی محسوس ہوتی ہے ۔ اور کچھ اُردو کا ڈھیلا لسانی سیاق و سباق ہے جسے تصورات کی تشکیل کے لیے استعمال نہیں کیا گیا ہے ، اس لیے اردو زبان بالغ اور بھر پور اظہار کی صلاحیت سے عاری رہی ہے ۔ ابھی تک اُردو زبان میں غیر ملکی ادب کا جو کچھ ترجمہ ہوا ہے وہ ہر ایک کے سامنے ہے ، دنیا کی دوسری زبانوں میں قارئین دوستو فسکی ، بودلیر ، شکسپیئر ، سفوکلیز، نطشے ، ہیگل ، کانٹ نہ

جانے کون کون سے ادیبوں اور مفکرین کی تخلیقات سے بہرہ ور ہوئے ہیں لیکن ہمارے یہاں صرف انگریزی خواں طبقہ ان سے مستفید ہو سکتا ہے ، علم اور ہدایت کے یہ سرچشمے ایک خصوصی طبقاتی حق بن گئے ہیں ، لیکن کیوں ؟ اس لیے کہ ہمیں اپنی اہم ضرورتوں کا احساس نہیں ہے ۔ ہمارا شاعر یا ادیب ایک لنگڑی سی غزل اور نیم جان سا افسانہ لکھ کر اپنی جان چھڑاتا ہے اور اپنی مکمل ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونے سے گریز کرتا ہے یہ ذکر بے محل نہیں کہ ہمارے شاعروں یا ادیبوں نے اپنے تخلیقی عمل کو شعری یا نثری ہیئتوں کے چھوٹے چھوٹے خانوں میں بانٹ رکھا ہے، جب شعر و ادب ایسی نزاعی موقعیت میں الجھا ہو کہ زبان بالیدگی فکر کی متحمل نہ ہو تو اس وقت تمام شاعروں اور ادیبوں کی یہ ذمہ داری ہوتی ہے کہ وہ من حیث المجموع شعر و ادب اور زبان میں مختلف ذرائع سے توانائی پیدا کریں اس کے مزاج ، رنگ و آہنگ اور ذرائع کے امکانات کا جائزہ لیں ۔

اس کے برعکس ہمارا دانشور طبقہ ماکی تخلیقات کے تراجم کی بجائے سرقہ بالجبر سے کام لیتا رہا ہے ۔ جب جی چاہا حسب ضرورت کسی مفکر یا مصنف کی تخلیق سے کچھ حصہ اخذ کیا ، بعض دفعہ اس کا حوالہ درج کیا اور بعض دفعہ اس کا نام گول کرکے اپنا نام جڑ دیا ، جس سے نہ تو ماخوذ تصور کی صحت کا سراغ مل سکتا ہے اور نہ اس کے سیاق و سباق کا ، کیونکہ اُردو خواں قاری کے لیے اصل متن دوسری زبان کے لبادے میں نظر سے اوجھل رہتا ہے ۔ ترجمے کا یہ بالواسطہ اسلوب گوجزوی طور پر نظریات کے انتشار میں معاون تو ضرور ثابت ہوتا ہے ، مگر ان کی صحت اور افادیت ایک حد تک مشکوک رہتی ہے ۔ اگر ایک طرف نئے معاشرتی ، سیاسی ، علمی و ادبی نظریات کی آفرینش کے لیے براہ راست تراجم کی ضرورت ہے تو دوسری طرف اُردو زبان کی نئی تشکیل اور وسعت کے لیے اس میں نئے تصورات ، نئے الفاظ اور نئے جذباتی پیرایوں کو منتقل کرنے کی ضرورت ہے۔ اہل ایران کو دیکھیے کہ انہوں نے اپنے کثیر علمی و ادبی ذخیرے کے باوجود فارسی جدید کی تعمیر و تشکیل کے لیے بیسویں صدی کا نصف سے

زیادہ حصہ وقف کر دیا ہے ۔ یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ اہل ایران نے تمام دنیا کے عظیم ادب کے تراجم کرکے فارسی جدید کو اظہار کے اس مرحلہ پر پہنچایا ہے ، جہاں اس میں ہر طرح کے علمی ، سائنسی، معلوماتی الفاظ ، تراکیب اور اصطلاحوں کے ذخیرے دستیاب ہیں، اس سے بڑھ کر اور کیا ثبوت ہو سکتا ہے کہ انہوں نے سرکاری اور تعلیمی سطح پر فارسی کو ابلاغ و اظہار کا ذریعہ بنایا ہے ۔ یہ درست ہے کہ ایران جدید کا سیاسی ماضی ہمارے سیاسی ماضی سے مختلف ہے ، تاہم انہوں نے من حیث القوم تراجم کیے اور ان کی معیاری اشاعت کے نہ ختم ہونے سلسلے کے ذریعے جدید فارسی کی تعمیر کی ہے ۔ اہل ایران نے جدید فارسی کی تعمیر میں فرانسیسی زبان سے بھی مدد لی ہے جو ایران میں فارسی کے بعد ثانوی درجہ رکھتی ہے ۔ اہل ایران کے برعکس ہمارے یہاں اُردو زبان کی تشکیل کا کوئی واضح لائحہ عمل نہیں ہے کہ اردو زبان کی توسیع و تشکیل کے عمل میں کن زبانوں سے استفادہ کیا جا سکتا ہے ، مغربی زبانوں میں انگریزی زبان کا اثر و نفوذ اتنا واضح ہے کہ مزید شرح کا محتاج نہیں ہے البتہ اس کے بارے میں بھی لائحہ عمل مرتب کرنے کی ضرورت ہے کہ اس کے الفاظ و تراکیب کو کس حد تک اور کس طرح ''اردوایا'' جائے۔ اسی طرح فارسی زبان سے بھی ہمارا تعلق کچھ مبہم سا ہوتا جا رہا ہے ۔ لسانی سطح پر ابھی تک ہمارا رابطہ کلاسیکی فارسی سے رہا ہے اور ہم نے عمداً کلاسیکی فارسی کے لہجوں کو اپنایا ہے ، اردو زبان نے جو کچھ فارسی سے حاصل کیا ہے وہ کلاسیکی ہے ، اس کی اغلب وجہ یہ ہے کہ ۱۸۵۷ء کے بعد اہل ایران سے ہمارا رابطہ ختم ہو چکا تھا اور اُردو زبان نے اپنے تشکیلی مراحل میں انگریزی کی طرف رجوع کیا تھا ۔ مختلف زبانوں میں زبان کی رنگت سیاسی اور تجارتی اور دیگر محرکات کے زیر اثر بدلتی رہتی ہے ، اب جب کہ قومی سطح پر انگریزی زبان کو واپس اس کے ملک بھیجنے کا مسئلہ زیر غور ہے ، اس لمحے اس کا نعم البدل تلاش کرنے کی ضرورت بھی ہے کیونکہ پسماندہ زبانوں کو اپنے توسیعی عمل میں ترقی یافتہ زبانوں سے تعلق

رکھنا اگر ناگزیر نہیں تو ضروری ہے ، اس لیے کوئی زبان تنہائی میں نشو ونما نہیں پا سکتی ۔ فی زمانہ علوم ، ادبیات اور فنون تنوع اور لسانی قید و بند کے باوجود ایک زبان سے دوسری میں منتقل ہونے کا رجحان رکھتے ہیں، وہ نظریاتی اور جذباتی بعد جو ٹیکنالوجی کی عدم موجودگی میں مختلف زبانوں اور ادبیات کو تنہا رہنے پر مجبور کرتا تھا ، کم و بیش ختم ہو چکا ہے۔ جہاں بھی کسی زبان یا ملک میں کوئی غیر معمولی کارنامہ پذیر ہوتا ہے۔ ہر ایک اس سے رابطہ استوار کرنے کی کوشش کرتا ہے ۔ عہد جدید میں زندگی گزارنے کے لیے اپنے اردگرد سے آگاہی لازمی ہے ۔ ہر ایک زبان کو عہد جدید سے ربط استوار رکھنے کے لیے ایک دوسری زبان پر بھروسہ کرنا پڑتا ہے ۔ ہمیں اُردو زبان کی توسیع اور تعمیر کے لیے انگریزی کو ملک بدر کرنے کے باوجود علمی و ادبی سطح پر قائم رکھنا ہو گا ۔ کیونکہ ہمارا بیرونی دنیا سے رابطہ اسی زبان کے توسط سے ہے ۔ اگر پہلے اس زبان کو ہمارے معاشرے میں مرکزیت تھی تو اب اس کی حیثیت خبر کے ایک ذریعہ کی ہونی چاہیئے دوسری طرف اردو زبان میں نئے لہجے پیدا کرنے کے لیے اسے نہ صرف مقامی زبانوں سے متصل کرنا ضروری ہے بلکہ فارسی جدید سے اس کا ربط استوار کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے ، فارسی اردو زبان کی نسبت زیادہ با صلاحیت اور مضبوط زبان ہے جس نے اپنی قوت کے لیے غیر ملکی ادب کے ہزارہا تراجم اپنے اندر سمونے کی کوشش کی ہے ۔ چنانچہ وہ محنت جو اہل ایران نے علوم و فنون اور ادبیات کی سطح پر کی ہے اردو زبان مزاج ، رسم الخط صرف و نحو اور ذخیرۂ الفاظ کے اشتراک کے با وصف اس سے بکمال آسانی مستفید ہو سکتی ہے ، وہ گھٹن ، وہ بے بسی اور کم مائیگی جو اردو زبان میں سنجیدہ اور غیر رسمی تحقیقات کے دوران پیش آتی ہے اس پر قابو پایا جا سکتا ہے ۔

تراجم کا عمل انسانی تمدن ، مزاج اور تاریخ کی دریافت اور شناخت کا ایک بھر پور ذریعہ ہے ، انسان جو رنگوں ، زبانوں اور جغرافیائی بندشوں اور سیاسی تفرقات کی بدولت انسان ہوتے ہوئے بھی ایک دوسرے کے لیے

اجنبی ہے ، ترجمے کے ذریعے ایک زبان کو اپنی زبان کے حروف تہجی میں ڈھالنے سے انسانی سطح پر ایک دوسرے سے تعارف حاصل کرتا ہے ۔ ابھی تک ہمارا غیر ملکی دنیا سے تعلق صحافتی اور اخباری سطح پر رہا ہے یعنی ہم یہ جانتے ہیں کہ فلاں ملک کس جگہ پر واقع ہے ۔ وہاں کس کی حکومت ہے اور لوگ کون سی زبان بولتے ہیں ، یہ تعلق معلوماتی اور علمی اعتبار سے افادی تو ضرور ہے لیکن وہاں کے جمہور کے مزاج ، تمدن اور زندگی کے ذہنی اور جذباتی رنگ و آہنگ کی خبر نہیں دیتا ، اپنے آپ کو جذباتی اور ذہنی سطح پر با خبر رکھنے کے لیے دوسروں کا دکھ درد جاننے اور شرکت کرنے کے لیے ترجمہ ہی ایک ایسا وسیلہ ہے جو خبر کا ذریعہ بنتا ہے ۔ جو انسانوں میں اشتراک کا قرینہ پیدا کرتا ہے ۔ چنانچہ زبان کی توسیع تمدن کے تعارف ، انسانی کائنات کی دریافت اور تاریخ کے وقوف کے لیے ایک سے زیادہ زبانوں سے رابطہ پیدا کرنا ضروری ہے ہمارے یہاں تہذیبی ، معاشرتی اور ادبی سطح پر وہی معیار رہے ہیں جو انگریزی زبان کے ذریعے ہم تک پہنچے ہیں ، جس طرح ۱۸۵۷ء کے بعد یہاں کے لوگوں کے لیے انگریز اور انگریزی زبان ، مغربی تمدن اور علم کی واحد اور آخری صورت تھی ، اسی طرح آج بھی ہمارے لیے لسانی مجبوریوں کی بدولت انگریزی زبان مغربی علم و فنون کی معرفت کا ذریعہ ہے ۔ جو فکر اور جذباتی اسلوب ہمیں انگریزی زبان کے ذریعے ملتے ہیں ہم اسی پر اکتفا کرنے پر مجبور ہیں ۔ یہ درست ہے کہ انگریزی مغرب کی سب سے اہم زبان ہے لیکن کیا یہ تمام دنیا کے ادب اور علوم کو ہم تک پہنچا رہی ہے ؟ فی زمانہ ہر کوئی تعصبات اور سیاسی مصلحتوں کی زنجیر میں ہے اور صرف اسی فکر یا چیز کی نمائندگی پر توجہ دیتا ہے جو اس کے مقاصد سے مطابقت رکھتی ہے ، اگر اس مفروضہ نما حقیقت کی صحت پر اعتماد کیا جائے تو پھر تراجم کے لیے ایک سے زیادہ زبانوں کے ادبیات اور دیگر علوم سے رابطہ قائم کرنے کی ضرورت ہے ۔

ہم براہ راست تراجم، بالواسطہ تراجم اور براہ راست مطالعہ کے توسط سے اہل مغرب کے بارے میں کافی کچھ جانتے ہیں ۔ لیکن ابھی تک ہماری

نگہ سے مشرق وسطیٰ ، مشرق بعید اور ہند چینی کی دنیا کے بہت سے گوشے مخفی ہیں ، ایک اعتبار سے ان علاقوں کے لوگوں کا سیاسی اور معاشی مقدر ہم سے چنداں مختلف نہیں ہے اور وہ جغرافیائی اور کسی حد تک نسلی اعتبار سے بھی ہم سے کچھ قریب ہیں ، ہم ان کی دنیا سے بے خبر ہیں ، ہم براعظم افریقہ اور جنوبی امریکہ کے بارے میں صرف اتنا ہی جانتے ہیں جتنا یو این او کی مطبوعات ہمیں بتاتی ہیں۔ ان علاقوں اور خطوں کے لوگ اپنے مقسوم کی تشکیل میں جس جدوجہد سے گزر رہے ہیں ، ہم ان سے واقف نہیں ہیں ، کیا یہ ضروری نہیں ہے کہ ہم تراجم کے ذریعے ان کی زندگی میں شرکت کر سکیں اگر وہ مظلوم ہیں تو ان کی حمایت میں آواز اٹھا سکیں ؟ اگر وہ ظالم ہیں تو ان کے خلاف جدو جہد کریں ؟ لیکن ان تک پہنچنے کے لیے انہیں جاننا ضروری ہے چنانچہ اس وقت تراجم کے سلسلے میں خصوصاً ایسی اقوام کی ادبیات کو اہمیت دینی چاہیے جو تاریخی جدوجہد میں مصروف ہیں ۔ یہ ترجمے کی ضرورت کا ایک اہم پہلو ہے جو اتنا ہی اہم ہے جتنا متمدن ملکوں کی ترقی یافتہ زبانوں کے علم و ادب کے ترجمہ کا !

دوسری زبانوں سے اپنی زبان میں ترجمہ کرنے کا عمل دوسری تہذیب کو اپنی طرف کھینچ کر لانے کا عمل ہے ۔ ترجمہ کا دوسرا رخ اپنے آپ کو دوسری تہذیبوں تک لے جانے کا ہے ! اس ذیل میں اردو زبان اور دیگر علاقائی زبانوں کے ادب کا غیر ملکی زبانوں میں ترجمہ بھی اتنا ہی اہم ہے جتنا غیر ملکی ادب اور دیگر علوم کا ۔ ملکی ثقافتی ہم آہنگی کے لیے (جب کہ اردو زبان پاکستان کے کسی خطے میں نہیں بولی جاتی) یہ ضروری ہے کہ علاقائی زبانوں کے ادب کو نہ صرف بین الصوبائی زبانوں میں ترجمہ کیا جائے بلکہ تمام کو اردو زبان میں منتقل کرنے کی ضرورت بھی ہے کہ ایک ہی خطے کے لوگ تمدنی سطح پر ایک دوسرے سے آگاہی حاصل کر سکیں ۔ اردو زبان کی ترویج و توسیع کے لیے لازم ہے کہ اسے پاکستان کی سرزمین پر اس کے زمینی رشتے سے وابستہ کیا جا سکے اس میں فوک لور ، اساطیر اور تہذیبی عناصر کو شامل کیا جا سکے ۔ چنانچہ اس لسانی اور ثقافتی

ضرورت کے پیش نظر بین الصوبائی ادبی رابطے کے لیے ایسے تراجم کے مستقل ادارے قائم کیے جانے چاہئیں ۔ اسی طرح ملکی سطح پر یہاں کے ادب کو غیر ملکی زبانوں میں منتقل کرنے کے لیے قومی سطح پر مختلف زبانوں میں تراجم کے ادارے قائم کیے جانے اشد ضروری ہیں ، جس طرح غیر ملکی ادب کو اردو اور دوسری علاقائی زبانوں میں منتقل کرنے کی ضرورت ہے ۔ اسی طرح پاکستانی ادب کی غیر ملکی ترسیل بھی کسی قدر غیر اہم نہیں ہے ایک طرف غیر ملکی ادبیات اور علوم کو اردو اور دیگر علاقائی زبانوں میں منتقل کرنا اور دوسری طرف اپنے ادب کو دنیا کی ہر سمت میں پھیلاتا بین الاقوامی سطح پر ایک وسیع تر رابطے کی کوشش ہے ۔

ادبیات کی درآمد و برآمد کا عمل اسی وقت سنجیدگی کا رتبہ اختیار کر سکتا ہے اگر ہم ضرورتوں کے سیلاب میں اہم اور غیراہم ضرورتوں میں حفظ مراتب کا قرینہ معین کر سکیں ، اپنے آپ سے باہر نکل کر اپنے وجود کا معروضی مشاہدہ کریں ، زندگی اور انسانی مسائل کو وسیع تر تناظر میں دیکھنے کا حوصلہ رکھتے ہوں ۔

rekhta

ترجمے کے اصول

دور تراجم[1]

ہمارا زمانہ تعلیم و تربیت کا زمانہ ہے ، ہمارا زمانہ تہذیب و تمدن کا زمانہ ہے ، ہمارے زمانے میں علوم و فنون کی کثرت ہے ، ہمارے زمانے میں اختراعات و ایجادات کی بھر مار ہے ۔ آج کل تصنیفات و تالیفات کا بازار گرم ہے ۔ ان دنوں زندگی کے ہر شعبے میں ترقی کے آثار نمودار ہیں ، مگر اس دور میں جو شے اوروں سے زیادہ ممتاز اور سب سے زیادہ نمایاں ہے وہ ترجمہ ہے۔ اس لیے اگر اس دور کو 'دور تراجم' کہا جائے تو بیجا نہ ہو گا کیونکہ اس زمانے کی تصنیف اور تالیف جو کچھ ہے وہ ترجمے کے رنگ میں ڈوبی ہوئی ہے ۔

اس امتیاز کی سب سے بڑی وجہ سلطان العلوم اعلیٰ حضرت شہنشاہ دکن کی علم پروری اور اردو نوازی ہے ۔ آپ کی شاہانہ فیاضیوں اور علمی قدر دانی نے ہندوستان میں اردو یونیورسٹی قائم کرکے کم مایہ اور نو عمر اردو کا پایہ عرش اعلیٰ تک بلند کر دیا ہے ۔ اگر چندے یہی لیل و نہار رہے تو وہ وقت دور نہیں کہ یہی سبک مایہ اور نو خیز زبان ''السنۂ عالم'' کے دوش بدوش نظر آئے گی ۔ جن لوگوں کو حضرت مولانا مولوی سید وحید الدین سلیم (مرحوم) پروفیسر جامعۂ عثمانیہ کی زندۂ جاوید تصنیف وضع اصطلاحات کے مطالعے کا موقع ملا ہے وہ جانتے ہیں کہ اردو کی کیا شان ہے اور اس میں ترقی کرنے اور علمی زبان بننے کی کس قدر صلاحیت مضمر ہے ۔

یہ امر مسلم الثبوت ہے کہ جب کوئی قوم علوم و فنون میں ترقی کا پہلا قدم اٹھاتی ہے تو سب سے پہلے علمی زبانوں کے تراجم سے اپنی زبان کو

۱۔ دور تراجم از حاجی احمد فخری مطبوعہ رسالہ سہ ماہی 'اردو' انجمن ترقی اردو (دکن) اکتوبر ۹۲۹ء صفحات ۵۹۳-۶۰۹ ۔

سرمایہ دار بناتی ہے ۔ اور زندہ اقوام کی سعی و کوشش کے نتائج کو اپنے اندر جذب کرکے اپنے علمی خزانوں کو معمور کرتی ہے ۔ چنانچہ قدمائے عرب نے اپنی ترقی کے زمانے میں یہی کیا کہ دوسری اقوام کے علمی خزانوں کو اپنی زبان میں منتقل کر لیا اور ان کے جواہر ریزوں کو اپنی زبان کے نقش و نگار میں برتا ۔ یہی باعث ہے کہ علوم قدیمہ میں کوئی علم ایسا نہیں ہے جس سے عربی کا خزانہ خالی ہو ۔ اگر دنیا میں عربوں کا وجود نہ ہوتا تو صدیوں تک اقصائے عالم پر جہل و نادانی کا بادل اسی طرح محیط رہتا جس طرح عروج اسلام سے قبل تھا ۔ اگر ایک ابن رشد کی ذات عالم وجود میں جلوہ گر نہ ہوتی تو ارسطو اور اس کا فلسفہ دونوں کے دونوں صفحۂ ہستی سے اس طرح معدوم ہو جاتے کہ گویا کبھی عالم وجود میں آئے ہی نہ تھے ۔

جب یہ مرحلہ خاطر خواہ طے ہو چکتا ہے تو قوم ترقی کے میدان میں دوسرا قدم اٹھاتی ہے اور تصنیف و تالیف کا جامہ پہن کر زندہ اور ترقی یافتہ قوموں کی صف میں نظر آنے لگتی ہے ۔ نہ آج تک کبھی اس کے خلاف ہوا ہے اور نہ توقع ہے کہ اس کے خلاف کبھی ہوگا ۔ یہی باعث ہے کہ فرماں روائے دکن کی شاہانہ اولوالعزمیوں کے طفیل ہندوستان کے بہترین دل و دماغ اپنی تمام تر توجہ اسی مفید و کار آمد صنف کی طرف مبذول فرما رہے ہیں ۔ اندریں حالات یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ترجمے کے ماله و ماعلیه پر غور کریں اور یہ دیکھیں کہ ترجمہ کیا ہے اور وہ اصول کیا ہیں جن کی پابندی سے ترجمہ کہلانے کا مستحق ہوتا ہے اور جس کی خلاف ورزی سے ترجمہ اپنے مرتبے سے گر جاتا ہے اور اس قابل نہیں رہتا کہ اس پر ترجمے کا اطلاق ہو سکے ۔ آخر کچھ تو بات ہے کہ 'معرکۂ مذہب و سائنس'، اور 'فلسفۂ تعلیم'، معمولی تراجم سے ممتاز ہیں ۔

ترجمے کی تعریف :

ہمارے نزدیک ترجمے کی تعریف یہ ہے کہ کسی مصنف کے خیالات کو لیا جائے ، ان کو اپنی زبان کا لباس پہنایا جائے ان کو اپنے الفاظ و

محاورات کے سانچے میں ڈھالا جائے اور اپنی قوم کے سامنے اس انداز سے پیش کیا جائے کہ ترجمے اور تالیف میں کچھ فرق معلوم نہ ہو ۔

اس تعریف کی رو سے یہ امر بلاشائبۂ شک ثابت ہوتا ہے کہ ترجمے میں مترجم پر مصنف کے خیالات کی پابندی فرض ہوتی ہے ، اس کے الفاظ و محاورات اور اس کے اسلوب بیان کی تقلید فرض نہیں ہوتی ۔ اگر ان باتوں کی پابندی ضروری ہوتی تو اصل زبان میں کیا برائی تھی کہ زحمت ترجمہ گوارا فرمائی جاتی ۔ اگر اس قسم کی لغو اور لایعنی پابندیاں کہیں نبھ جائیں اور کوئی باکمال مترجم ان بے کار اور غیر ضروری بندشوں سے عہدہ برا ہو بھی جائے تو اس کو محض اتفاق حسنہ پر محمول کرنا چاہیے ۔ اس کو شمع ہدایت سمجھنا اور اس پر فخر کرنا جائز نہیں اس لیے کہ بسا اوقات دو زبانوں کے انداز بیان میں اس قدر مغائرت ہوتی ہے کہ تقلید نا ممکن ہوتی ہے ۔ اگر کوئی خام مذاق اور نومشق مترجم تقلید کے پیچھے پڑتا ہے تو وہ غیر زبان کے الفاظ و محاورات کی بندشوں میں خود گم ہو کر رہ جاتا ہے پڑھنے والوں پر یہ بھی نہیں کھلتا کہ وہ کیا کہہ رہا ہے ۔ اور کس لیے کہہ رہا ہے ۔ مصنف کا مطلب کچھ ہوتا ہے ، مترجم کے الفاظ سے کچھ اور معلوم ہوتا ہے ۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ تقلید کی بدولت ترجمہ ترجمہ نہیں رہتا بلکہ لفظوں کا گورکھ دھندہ بن جاتا ہے ۔ ہمارے نزدیک ترجمے کا اصل اصول وہی بدنام اور مکروہ شے ہے ، جسے عرف عام میں تصرف اور پروفیسر حمید اللہ خاں صاحب کی زبان میں "خیانت اور بددیانتی" کہتے ہیں تصرف کے بغیر ترجمے میں نہ کبھی کام چلا ہے اور نہ آئندہ چلنے کی امید ہے ۔ اسی باب میں جس قدر آزادی سے کام لیا جائے گا ترجمہ اسی قدر تصنیف کے قریب آ جائے گا ۔ مگر یہ یاد رکھنا چاہیے کہ ترجمے میں تصرف کرنا کچھ اُن ہی بزرگوں کو زیبا ہے جو دونوں زبانوں کے ماہر ہوتے ہیں اور اُس علم میں یہ طولیٰ رکھتے ہیں جس کا ترجمہ کرنے کی وہ جسارت فرماتے ہیں ۔ بلکہ دونوں زبانوں میں سے ایک زبان مترجم کی مادری زبان ہوتی ہے ۔ آج کل جن دو زبانوں کی ضرورت ہے ان میں سے ایک انگریزی ہے اور دوسری اردو ۔ ایک قدیم اور سرمایہ دار زبان ہے اور دوسری نو عمر

اور کم مایہ ۔ ایسی حالت میں مترجم کا فرض ہے کہ انگریزی سے کماحقہ واقف ہو اور اردو اس کی مادری زبان ہو ۔ اگر اردو اس کی مادری زبان نہ ہوگی تو وہ ترجمے کی بندشوں سے عہدہ بر آ نہ ہو سکے گا اور اگر انگریزی سے پوری طرح واقف نہ ہو گا تو مصنف کے خیالات کی تہ تک نہ پہنچ سکے گا ۔ الغرض ان اوصاف سہ گانہ میں جس نسبت سے کمی ہو گی ، ترجمے میں اسی نسبت سے خامیاں رہ جائیں گی ۔

زباندانی کا معیار :

اب بحث طلب امر یہ ہے کہ زباندانی کا معیار کیا ہے اور وہ کون سی کسوٹی ہے جس پر کس کر یہ بتایا جا سکتا ہے کہ کون شخص زباندان ہے اور کون نہیں اور کس کے مضمون میں کس قدر الفاظ و محاورات ہیں کہ اس معیار پر پورے اترتے ہیں اور کس قدر ہیں کہ اپنا سا منہ لے کر رہ جاتے ہیں ۔ شمالی ہندوستان اور قلمرو نظام میں ایک شخص بھی ایسا نہ ہو گا جو اُردو دانی کا مدعی نہ ہو اور جسے اس امر کا دعویٰ نہ ہو کہ اردو میری مادری زبان ہے اور میں نے اس کو اُس عالم میں حاصل کیا ہے جب میں میں نہ تھا دلی اور لکھنؤ کے رہنے والے تو خالص اہل زبان ہیں ، اُن کا تو کیا کہنا ، ان کے لیے تو یہ امر باعث ننگ و عار ہے کہ اُن کا دامن ادب شرمندۂ تعلیم ہو مگر :

جس پاس عصا ہو اُسے موسیٰ نہیں کہتے
ہر ہاتھ کو عاقل ید بیضا نہیں کہتے

روزانہ بول چال میں اپنا ما فی الضمیر ادا کر دینا اور معمولی چھٹی چپاتی لکھ لینا اور بات ہے اور ادیبانہ انداز سے اپنا مطلب بیان کرنا اور اس میں کشش و گہرائی پیدا کرکے ناظرین کے دلوں پر اثر کرنا اور بات ہے ۔ اس باب میں اہل زبان اور بیگانۂ زبان و لسان ، نیم تعلیم یافتہ اور فارغ التحصیل ، سب برابر ہیں ، جب تک کوئی شخص متواتر اور پے در پے زبان کی نزاکتوں پر غور نہیں کرتا اور جب تک اپنے خیالات مختلف اور گوناگوں انداز سے پبلک کے سامنے پیش کرنے کی مشق و مزاولت بہم نہیں

پہنچاتا اس وقت تک وہ ترجمے اور تصنیف و تالیف کی ذمہ داریوں سے سبک دوش نہیں ہو سکتا ، لیکن دلی اور لکھنؤ والے اس میں جس قدر جلد اور جس قدر آسانی سے کمال پیدا کر سکتے ہیں اس قدر جلد اور آسانی سے غیر نہیں کر سکتے ، خواہ وہ پنجاب کے رہنے والے ہوں یا دکن کے ، خواہ وہ دلی اور لکھنؤ میں سے کسی کی تقلید کو ضروری سمجھتے ہوں یا دونوں سے آزاد ہونا اپنی شان کے شایان خیال کرتے ہوں ۔

اس زمانے میں یہ بات عام طور پر دیکھی جاتی ہے کہ لوگ انگریزی میں فی الجملہ بصیرت حاصل کر لیتے ہیں اور اس کے پروں پر اُڑ کر مملکت اردو کو تسخیر کرنا چاہتے ہیں ۔ ان کے دل و دماغ پر اس خیال خام کا غلبہ ہوتا ہے کہ اردو ہماری مادری زبان ہے ، اس میں کد و کاوش لاحاصل ہے ، اس میں سعی و کوشش ہماری شان کے شایان اور ہماری ہمت کے لائق نہیں ۔ اس طرف صرف وہی کوتاہ بیں اور ناعاقبت اندیش لوگ توجہ کرتے ہیں جن کے دماغ عقل سلیم سے عاری ہوتے ہیں ۔ اردو انگریزی کے تابع ہے ، جب انگریزی آ گئی تو اردو خود بخود آ جائے گی ۔ "بانو کو تسخیر کر لو باندی خود بخود حاضر ہو جائے گی" ۔ مگر یہ اُن حضرات کی کوتاہ نظری اور خام مذاق کی دلیل ہے ۔ اردو کتنی ہی سبک مایہ اور نو عمر سہی ، مگر زندہ زبان ہے ، اس کا وجود انگریزی پر مبنی نہیں ۔ صرف چند بڑے بڑے اصول ہیں کہ انگریزی سے ملتے جلتے ہیں ، ورنہ دونوں میں کوئی تعلق نہیں ۔ جب تک اردو پر اردو کی حیثیت سے توجہ نہیں کی جاتی ، اس وقت تک اردو میں بصیرت نصیب نہیں ہوتی ۔ کسی موضوع کو لینا اور اُس کو مؤثر اور دلکش انداز سے پڑھنے والوں کے دلوں پر نقش کرنا ، ایک فن ہے جو مدتوں کی کد و کاوش اور سالہا سال کی سعی و کوشش سے حاصل ہوتا ہے اور جس شے کا نام ادبی سادگی ہے وہ تو ایک ایسا کمال ہے جو تمام کمالات ادب کے بعد نصیب ہوتا ہے ۔ یہی باعث ہے کہ میر انیس جیسے قادر الکلام بزرگ کو کہنا پڑا ہے کہ :

اس سادگی کی قدر کوئی جانتا نہیں
جو جانتا ہے اور کو وہ مانتا نہیں

(ہمارے نزدیک مترجم اور مصنف میں کچھ فرق نہیں ، دونوں کی حدیں ایک مقام پر جا ملتی ہیں ۔ کامیاب اور قابل تقلید مترجم وہی شخص ہو سکتا ہے جس میں مصنف بننے اور تصنیف کرنے کی صلاحیت مضمر ہوتی ہے اور ترجمے کی گوناگوں ذمہ داریوں سے وہی شخص عہدہ برا ہو سکتا ہے ، جس نے انداز بیان پر اس درجے قدرت حاصل کر لی ہو کہ جس مطلب کو جس پہلو سے چاہے ادا کر جائے ۔ بہترین مترجم وہی بزرگ ثابت ہوئے ہیں جن میں یہ قوت بوجہ اتم موجود تھی) لیکن جن لوگوں میں یہ قوت کم تھی وہ کامیابی اور شہرت کے میدان میں اسی قدر پیچھے رہ گئے جس قدر اس قوت میں کمی تھی ۔ جو لوگ مصنف کے انداز بیان کی تقلید سے انحراف کرنے اور ترجمے میں تصرف سے کام لینے کی قوت نہیں رکھتے اُن کی ادبی زندگی محض عارضی اور چند روزہ ہوتی ہے ، بلکہ مرنے سے پہلے ہی ان کا خاتمہ ہو جاتا ہے ۔ حیات ابدی اور شہرت سرمدی کچھ ان ہی بزرگوں کا حصہ ہے جو منظر عام پر جلوہ گر ہونے سے پہلے کمالات صوری و معنوی سے بہرہ اندوز ہوتے ہیں اور شب و روز کی متواتر اور جانکاہ محنت سے اپنے اندر وہ قابلیت پیدا کر لیتے ہیں جو ادائے فرض کے لیے ضروری اور لا بدی ہوتی ہے ۔

مثال کے طور پر مرزا غالب کو لیجیے اور ان کے ایک شعر پر غور کیجیے۔ فرماتے ہیں :

محرم نہیں ہے تو ہی نواہائے راز کا
یاں ورنہ جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا

کیا کوئی شخص اس غیر فانی شعر پر ترجمے کا الزام عائد کر سکتا ہے ، کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ یہ ترجمہ ہے ، کیا اس میں وہ تمام خوبیاں موجود نہیں ہیں جو اعلیٰ درجے کے شعر میں ہونی چاہئیں ، کیا اس میں وہ تمام اوصاف و صفات موجود نہیں جو شعر کی جان اور ادب کی روح رواں ہیں ؟ اب ذرا عرفی شیرازی کا شعر ملاحظہ ہو :

ہر کس نہ شناسندہ راز است وگرنہ
اینہا ہمہ راز ست کہ معلوم عوام است

کیا مرزا کا شعر عرفی کے شعر پر مبنی نہیں ہے ، کیا مرزا نے اس سے استفادہ نہیں کیا ہے ، کیا مرزا نے اس شعر کی روح کو اپنے الفاظ میں جلوہ گر نہیں کیا ہے ، اور کیا اپنی طرف سے اس پر ایک گونہ لطیف اور پاکیزہ اضافہ نہیں فرمایا ہے ، اور کیا اپنے انداز خاص میں کد و کاوش اور مذاق سلیم کی داد نہیں دی ہے ، کیا اس میں اور تصنیف میں کچھ فرق ہے ، کیا اس میں وہ تمام باتیں موجود نہیں ہیں جو تصنیف کے لیے لازمی ہیں اور کیا مرزا اس میں حق بہ جانب نہ تھے ، کیا اس پر سرقے کا الزام اور چوری کا بہتان عائد ہو سکتا ہے ؟ ہمارے نزدیک اس قسم کے باریک اور لطیف اضافوں پر سرقے کا الزام لگانا اور ان کو خیانت اور بد دیانتی پر محمول کرنا ذوق سلیم کا منہ چڑانا ہے اور یہ صرف ان ہی لوگوں کا حصہ ہے جو انگریزی کے پروں پر اُڑ کر قلم رو اردو کو عبور کرنا چاہتے ہیں ۔ اس امر سے کوئی صاحب ذوق انکار نہیں کر سکتا کہ اسی قسم کے نازک اور لطیف اضافے کا نام تصرف ہے اور یہی ترجمے کی جان اور ادب و انشا کی روح و رواں ہے ۔ ہمارے نزدیک ترجمے کی بہترین مثال یہی ہے اور اسی کی تقلید ہونی چاہیے ۔

اسی طرح شیخ علی حزیں ، کا ایک شعر ملاحظہ ہو ۔ فرماتے ہیں :

چون نفی نفی اثبات است ، از مردن نمی ترسم
بقائے من ، چو شمع کشتہ باشد در فنائے من

میر 'انیس' اس کو لیتے ہیں اور اپنے انداز میں یوں ادا کرتے ہیں :

خود نوید زندگی لائی قضا میرے لیے
شمع کشتہ ہوں ، فنا میں ہے بقا میرے لیے

کیا میر صاحب کا یہ شعر شیخ کے شعر کا ترجمہ نہیں ہے ، کیا میر صاحب نے اپنے شعر کی بنیاد اسی شعر پر نہیں رکھی ہے اور کیا اس میں اپنی غیر معمولی شاعرانہ قابلیت سے تصرف نہیں فرمایا ہے ؟ اگر میر صاحب زحمت تصرف گوارا نہ فرماتے تو یہ شعر اس بلندی پر جلوہ گر نہ ہوتا ، جس پر اس وقت میر صاحب کے ذوق لطیف کے طفیل نظر آ رہا ہے ۔

ملا طاہر وحید کا ایک شعر ہے :

ز شیخ شہر جاں بردم بہ تزو یر مسلمانی
مدارا گر بہ ایں کافر نمی کردم چہ می‌کردم؟

ایک شخص نے اس کو لیا اور ان الفاظ میں اس کا ترجمہ کر دیا :

مسلماں بن کے جاں میں نے بچائی شیخ نجدی سے
مدارا گر نہ اس کافر سے میں کرتا تو کیا کرتا ؟

کیا یہ شعر ملا کے شعر کا صحیح ترجمہ نہیں ہے ، کیا اس میں کہیں کور کسر ہے ، کیا مترجم نے اس میں تصرف سے کام نہیں لیا ، کیا شیخ شہر کی جگہ شیخ نجدی ، نہیں کر دیا ہے اور "بہ تزویر مسلمانی کا ترجمہ" "مسلماں بن کے" نہیں کیا ، کیا اس سے بہتر انداز میسر ہو سکتا ہے ؟ یہ سب کچھ ہے ، مگر ارباب ذوق جانتے ہیں کہ یہ شعر اس قدر بلند نہیں ہے جس قدر ملا کا شعر ہے ۔ اس لیے کہ تصرف کچھ زیادہ باریک اور لطیف نہیں ہے اور مترجم اپنی طرف سے کوئی ایسا اضافہ نہیں کر سکا جس سے تصرف کرنے میں حق بہ جانب سمجھا جائے ۔ 'عرفی شیرازی' کا ایک اور شعر ہے :

مدہ عنان تملق بہ حسن ہر ذرہ بر آر دستے و بر فرق آفتاب انداز

اس کا ترجمہ جناب ، آزاد انصاری ان الفاظ میں فرماتے ہیں :

ذرات کی چمک پر کب تک مٹا رہے گا
اٹھ اور اٹھ کے اک دم ہاتھ آفتاب پر ڈال

کیا اس میں جناب 'آزاد' ترجمے کے فرائض سے عہدہ برا نہیں ہو سکے کیا اس میں تصرف کا عمل جلوہ گر نہیں ہے ، کیا جناب 'آزاد' پر خیانت اور بد دیانتی کا الزام لگایا جائے گا ؟ اس لیے کہ 'عرفی' کے شعر میں کہیں اٹھنے کا ذکر نہیں ہے ۔ اسی طرح حزیں کا شعر ہے :

مسی مالیدہ لب را رنگ پان است
تماشا کن کہ آتش دخان است

'سودا' نے اس کو لیا اور ان الفاظ میں ادا کر دیا :

مسی مالیدہ لب پر رنگ پاں ہے
تماشا ہے تہ آتش دھواں ہے

اس میں 'سودا' نے کسی قسم کا تصرف نہیں کیا ، اسی لیے اصل شعر میں کسی قسم کا اضافہ نہ کر سکا ، بلکہ شعر کو اس بلندی پر نہ پہنچا سکا ، جہاں حزیں نے اپنے شعر کو پہنچا دیا تھا ۔

قرآن مجید میں ایک آیت ہے ۔ انا عرضنا الامانۃ الخ ۔ خواجہ حافظ اس کو لیتے ہیں اور اپنے ناقابل تقلید انداز میں یوں ادا کرتے ہیں :

آسماں بار امانت نہ توانست کشید قرعۂ فال بنام من دیوانہ زدند

حقیقت میں ترجمہ اسے کہتے ہیں اور تصرف کی یہ شان ہے ۔

اسی طرح مندرجہ ذیل اشعار و اقوال کو لیجیے اور فرداً فرداً ہر ایک پر غور کیجیے اور یہ دیکھیے کہ ان میں کوئی شعر یا کوئی قول ایسا ہے جو تصرف کی دست برد سے محفوظ ہو :

بوے یار من ازیں سست وفا می آید
گلم از دست بگیرید کہ ازکار شدم

(نظیری نیشاپوری)

کیفیت چشم ، اس کی مجھے یاد ہے سودا
ساغر کو مرے ہاتھ سے لینا کہ چلا میں

(سودا)

در محفل خود راہ مدہ ہم چومنے را
افسردہ دل افسردہ کند انجمنے را
نہ کہیں عیش تمھارا بھی منغص ہو جائے
دوستو ! درد کو محفل میں نہ تم یاد کرو

(خواجہ میر درد)

دوستاں منع کنندم کہ چرا دل بہ تو دادم
باید اول بتو گفتن کہ چنیں خوب چرائی

(سعدی)

سناء ذكاه لايزال من دعاء الخفاش :

شپر گر نور آفتاب نه خواہد
نور بازار آفتاب نه کاہد (سعدی)

السعید من اکل وزوع و الشقی من مات وودع :

نیک بخت آنکه خورد و کشت
و بد بخت آنکه مرد و ہشت (سعدی)

السلطان احوج الی العقلاء من العقلاء الی السلطان :

پادشاہان به خرد مندان محتاج
تراند که خرد مندان به پادشاہاں :

(۱) منم ہر سخن را بیان معانی
منم جان و عقل و ہنر را قوالب
منم از نژاد بزرگان ساسان
که بودند شاہان چتر و کواکب (منو چہری)

I can explain the deepest thought in all sciences,
I am the heart and soul of reason and knowledge.
I am descended from the Imperial House of Saman,
Whose kings bore the power of sovereignty.

(۲) آب جیحون از نشاط روے دوست
خنگ ما را تا میان آید ہمی (رودکی)

Glad at the friend's return, the Oxus deep,
Up to our girths in laughing waves shall leap.

(۳) اگر شه روز را گوید شب است این
باید گفت اینک ماه و پروین

Should he (the king) say "the night is day"
Reply : Behold the moon and the pleides.

(۴) در شعر سه تن پیمبرانند ہر چند که لانبی بعدی
ابیات و قصیده و غزل را فردوسی و انوری و سعدی

پیار کرنے کا جو خوباں ہم په رکھتے ہیں گناہ
ان سے بھی تو پوچھئے تم ایسے کیوں پیارے ہوئے
(میر تقی میر)

گفته بودم غم دل باتو بگویم چو بیائی
چه بگویم که غم از دل برود چوں تو بیائی
(سعدی)

اُن کے دیکھے سے جو آ جاتی ہے منه پر رونق
وہ سمجھتے ہیں که بیمار کا حال اچھا ہے
(مرزا غالب)

دامان نگه تنگ ، گل حسن تو بسیار
گلچین بہار تو ز داماں گله دارد
مرے ذوق نظر کو دیکھنا بزم حسیناں میں
وہ گلچیں ہوں بجائے گل بھرونگا رنگ داماں میں
(وفا رام پوری)

عربی اقوال و ضرب الامثال : ''الکلب النجس مایکون اذا اغتسل''

سگ بدریائے ہفت گانه بشو چونکه تر شد پلید تر گردد
(سعدی)

الصمت زینة العالم و ستر الجاہل :

ترا خامشی ، اے خدا وند ہوش
وقار است و نا اہل را پردہ پوش (سعدی)

راع اباک یراع ابنک :

تو بجاے پدر چه کردی خیر
تاہماں چشم داری از پسرت (سعدی)

کل یوم ہو فی شان :

دل بھی تیرے ہی ڈھنگ سیکھا ہے
آن میں کچھ ہے آن میں کچھ ہے (درد)

The sphere, poetic has its prophets three
(Although there is no prophet after me)
Firdausi in the epic, in the ode
Sadi and in qasida Anwari. (Prof Brown's translation)

(۵) زشیر شتر خوردن و سوسمار عرب را بجائے رسیداست کار
که تخت ملکیان را کند آرزو تفو بر تو اے چرخ گردان تفو
(فردوسی)

From feeding on camel's milk and desert lizard, so have the affairs of the Arabs prospered.
That they covet the throne of the Chosroes.
Shame on thee O circling Heavens, shame,

(۶) عاقلے را پرسیدند نیک بخت کیست و بد بخت چیست ، گفت نیک بخت آنکه خورد و کشت و بد بخت آنکه مرد و ہشت (سعدی)

They asked of a wise man who is the man of good fortune & who of bad ?
He said "The man of good fortune is he who ate & tilled ; the man of bad fortune is he who died and left (everything) he had,

(۷) اگر جز به کام من آید جواب من وگرز و میدان و افراسیاب
(فردوسی)

If the answer prove contrary to my wish
Then I shall take the mace and the field against afrasiyab,

(۸) خروشید و جوشید و جامه درید بزاری بران کودک نا رسید
بر آورد بانگ و غریو و خروش زمان تازمان زوہمی رفت ہوش
(فردوسی)

She screamed and raved and rent her garment in lamentation over the unblossomed youth.
She sobbed and wailed and shouted & fainted again & again.

(۹) دلیرے که بد نام او اشکبوس ہمی بر خروشید برسان کوس
The intrepid Ashkboos roared like a drum

(۱۰) دلم از خدمت شیراز به کلی بگرفت
وقت آنست که پرسی خبر از بغدادم
سعدیا! حب وطن گرچه حدیثے است صحیح
نتوان مرد به سختی که من ایں جازادم (سعدی)

My soul is weary of shiraz, utterly sick and sad
If you seek news of my doings, you will have to ask at Baghdad
Saadi, that love of one's native land is a true tradition is clear,
But I cannot afford to die of want because my birth was here.

(۱۱) آن را که جائے نیست ہمه شہر جائے اوست
درویش ہر کجا که شب آمد سرائے اوست (سعدی)

حدیث از مطرب و مے گو و راز دہر کمتر جو
که کس نکشاید و نکشاید به حکمت ایں معمارا

Speak of the musician and of wine and search less into the secrets of futurity;
for no one in his wisdom ever hath discovered or everwill discover that mystery.

من از آن حسن روز افزون که یوسف داشت دانستم
که عشق از پردۂ عصمت برون آرد زلیخا را

I can understand how the beauty of Joseph, which added now luster to the day,
withdraw zalikha from the veil of her modesty.

بدم گفتی و خورسندم عفاک اللہ نکو گفتی
جواب تلخ مے زیبد لب لعل شکرخا را

Thou hast spoken evil of me, and I am contented-
God forgive thee.
Thou hast spoken well ; for even a bitter word is beseeming when it cometh from a ruby sugar-dropping lip.

نصیحت گوش کن جاناں کہ از جاں دوست تر دارند
جوانان سعادت مند پند پیر دانا را

Give ear O my soul, to good councel, for better than their own souls love youths of happy disposition the admonition of the aged wise.

غزل گفتی و در سفتی، بیا و خوش بہ خوان 'حافظ'
کہ بر نظم تو افشاند فلک عقد ثریا را

Thou hast composed thy ghazal ; thou hast strung thy pearls.
thy poetry the harmony-of the pleiades.

مندرجہ بالا سطور میں ترجمے کے جو نمونے ہدیۂ ناظرین کیے گئے ہیں ان سے ارباب بصیرت یہ ضرور محسوس کریں گے کہ ترجمے میں جو زبان برتی گئی ہے وہ انگلستان کی ٹکسالی زبان ہے، وہ ایسی زبان ہے جو شب و روز وہاں بولی اور لکھی جاتی ہے، وہ ایسی زبان ہے جو وہاں کے روز مرہ اور محاورے کے سانچے میں ڈھلی ہوئی ہے، وہ ایسی زبان نہیں جس کو دیکھ کر فصحائے انگلستان ناک بھوں چڑھائیں اور ٹکسال باہر سمجھ کر ردی کی ٹوکری میں ڈال دیں، بلکہ وہ ایسی زبان ہے کہ انگلستان کے

آدمیوں اور انشا پردازوں کے لیے باعث ناز اور موجب افتخار ہے - ہم نے متعدد انگریز حضرات سے سنا ہے کہ فٹز جیرالڈ نے عمر خیام سے صرف خیالات کا اقتباس کیا ہے اور مشرقی جذبات کو مغربی لباس میں اس خوبی اور خوش اسلوبی سے پیش کیا ہے کہ اگر وہ عمر خیام کا نام نہ لے تو کوئی متنفس اس پر سرقے کا الزام نہیں لگا سکتا - اسی طرح پروفیسر براؤن کی نسبت علمائے ادب کی یہ رائے ہے کہ "فارسی زبان کے شہ پاروں کو فصیح اور بلیغ انگریزی کا جامہ پہنانا اسی کا حصہ ہے" یہ ہے ترجمہ جو مترجم کے لیے مایۂ فخر و ناز اور اس کی شہرت اور ناموری کے لیے چشمۂ آب حیات ہے - اس کے بر عکس ہمارے یہاں کے ترجموں کو لیجیے اور ان پر ایک سرسری نظر ڈالیے، آپ کو معلوم ہو گا کہ ہمارے مترجم حضرات جو زبان برتتے ہیں وہ اردو نہیں ہے، بلکہ اچھی خاصی انگریزی ہے - وہی الفاظ و محاورات ہیں، وہی بندشیں اور ترکیبیں ہیں، وہی طرز ادا اور وہی اسلوب بیان ہیں کہ بے کم و کاست اردو میں برتے جاتے ہیں، اس لیے کہ ان بزرگ زادوں کے یہاں تصرف کا نام خیانت اور اجتہاد کا نام بد دیانتی ہے -

ترجمے کے اصول[1]

ابھی چند روز کی بات ہے کہ میں نے ایک انگریزی کتاب کا اردو ترجمہ شروع کیا ۔ اب جو دیکھتا ہوں تو ایک بحر بے کنار ہے اور میں ایک چھوٹی سی کشتی چپو کی مدد سے چلا رہا ہوں ۔ قدم قدم پر زبردست لہریں ملتی ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کشتی اب ڈوبی اور تب ڈوبی لیکن کوشش اور ہمت ابھی تک سہارا دیتی رہی ہے ۔ کہنے کو تو یہ محض استعارہ ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ میری دلی کیفیات کی ترجمانی اس سے بہتر نہیں ہو سکتی ۔

چند ہفتے قبل تک میں اُن لوگوں میں تھا جو اُردو کو ایک بہت گرانمایہ زبان سمجھتے ہیں اور اسے ہر خیال کو ادا کر سکنے کے قابل تصور کرتے ہیں ۔ افسوس ہے کہ اس ترجمے کے کام نے مجھے اپنا خیال بدلنے پر مجبور کر دیا ہے اور اب میرا عقیدہ یہ ہے کہ اُردو کی گرانمائگی صرف شعر و ادب اور اس مخصوص درباری تہذیب تک ہے ، جو ہمارے پیشرو ہمارے لیے ورثہ میں چھوڑ گئے ہیں ۔

میں اکثر حیران ہوا کرتا تھا کہ ہمارا تعلیم یافتہ طبقہ اپنی زبان کیوں نہیں بول سکتا اور کیوں اسے تقریباً ہر جملے میں انگریزی الفاظ استعمال کرنے کی عادت ہے ۔ اس کی ایک بڑی وجہ اب سمجھ میں آئی ہے اور وہ یہ ہے کہ اردو میں ابھی تک وہ الفاظ ہیں ہی نہیں جو مغرب سے آئے ہوئے خیالات کو ادا کر سکیں ۔

اور یہ بات کچھ اصطلاحات ہی تک محدود نہیں ہے ، اُردو میں اصطلاحات کا نہ ہونا کچھ تعجب کی بات نہیں کیونکہ جب علوم و فنون

۱- مطبوعہ ماہ نو کراچی ستمبر ۵۰ء صفحات ۱۹-۲۲ ۔

۸۴۴۱۰

ہی نہیں تو اصطلاحات کہاں سے آئیں گی ۔ غضب تو یہ ہے کہ ترقی یافتہ زبانوں میں جو عام بول چال کے الفاظ ہیں ان سب کے مترادفات بھی اردو میں موجود نہیں ہیں ۔ شاید بعض لوگوں کو یہ بات مبالغہ آمیز معلوم ہو ۔ ان کی تشفی کے لیے صرف تھوڑے سے ایسے عام الفاظ دیے جاتے ہیں جن کے مترادفات کم از کم میری دانست میں اردو میں اب تک موجود نہیں ہیں :-

Confidential, Vulnerable, Public, Explosive, Civil, Sleek, Manning, Streamlined, Mood, Graceful, Policy

اس قسم کے الفاظ کی سیکڑوں مثالیں دی جا سکتی ہیں ۔ لیکن میرے دعوے کے ثبوت کے لیے غالباً اتنی ہی کافی ہیں ۔

میں ان کوششوں سے بے خبر نہیں ہوں جو ریاست حیدر آباد مرحوم میں درسی اور غیر درسی کتابوں کو اردو میں منتقل کرنے کے سلسلے میں کی گئی ہیں اور مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ اصطلاحی اور غیر اصطلاحی الفاظ کی فرہنگیں بھی مرتب کی جا چکی ہیں ۔ لیکن ان کوششوں کا دائرہ اثر زیادہ تر حیدر آباد ہی تک محدود رہا اور جو الفاظ اور اصطلاحات حیدر آباد میں بالعموم استعمال کیے جاتے تھے ، حیدر آباد سے باہر ان کو کوئی جانتا بھی نہ تھا ۔ لہذا یہ کہنا زیادہ غلط نہیں کہ حیدر آبادی الفاظ اور اصطلاحات اُردو میں عام طور پر کبھی رائج نہیں ہو سکے ۔

اس سے یہ نہ سمجھا جائے کہ میں اُردو کی بجائے کسی اور زبان کو پاکستان کی قومی زبان بنانے کے حق میں ہوں ۔ یا اردو کی کم مائگی کا ذکر بطور استحقار کر رہا ہوں ۔ نہیں ۔ یہ اردو کی محبت ہی ہے جو مجھے نہایت افسوس کے ساتھ صاف گوئی پر مجبور کر رہی ہے ۔ مجھے یہ دیکھ کر بڑا رنج ہوتا ہے ۔ کہ ہم جب اظہار مطلب کے لیے انگریزی کے اس درجہ دست نگر ہیں ۔

یہاں ایک ممکن غلط فہمی کا ازالہ ضروری معلوم ہوتا ہے ۔ اُردو کی تہی دامانی سے مراد یہ نہیں ہے کہ اس میں امکانی قوتوں کا بھی فقدان ہے یا یہ کہ اس میں ترقی کی گنجائش ہی نہیں ۔ ایسا سمجھنا بالکل خلاف واقعہ

ہو گا ۔ اردو کے بڑے ماخذ تین ہیں ۔ عربی ، فارسی اور ہندی اور ان تینوں میں کم و بیش ایسی خصوصیات ہیں جو ترجمے کے کام میں بہت مدد دے سکتی ہیں ۔ عربی کی قواعد کچھ اس قسم کی ہے کہ ایک ہی لفظ کے بہت سے الفاظ بنائے جا سکتے ہیں ۔ فارسی زبان اپنی لطافت ، اور شیرینی اور شعریت کی وجہ سے ترجمے میں چار چاند لگا دیتی ہے اور بعض اوقات ہندی سے بھی ایسے الفاظ مل جاتے ہیں جو اپنی گویائی کے لحاظ سے لاجواب ہوتے ہیں ۔ جس زبان کو تین تین زبانوں کی امداد حاصل ہو اس میں ترجمہ کرنے کا کام بہت دشوار نہیں ہونا چاہیے ۔

ترجمے کے کام میں انگریزی اور دوسری ترقی یافتہ زبانوں سے بھی مدد لی جا سکتی ہے ۔ سینکڑوں انگریزی الفاظ اردو میں داخل ہو کر اس طرح گھل مل گئے ہیں کہ ان کا ترجمہ تلاش کرنے کی ضرورت نہیں ۔ وہ بلا تکلف اُردو کے الفاظ کی طرح استعمال کیے جا سکتے ہیں ۔ ایسے الفاظ کی مثالیں دینے کی ضرورت نہیں ۔ لیکن بہت سے انگریزی الفاظ ایسے ہیں ، جو باوجود پشتوں سے استعمال ہونے کے ابھی تک اردو کا جزو نہیں بن سکے اور ان کا بدیسی پن صاف نظر آتا ہے ۔ ایسے الفاظ کی دو قسمیں ہیں اول وہ جو ہو بہو یا اردو لب و لہجہ کے مطابق خفیف ترمیم کے ساتھ اپنائے جا سکتے ہیں ۔ مثلاً

Studio	استودیو	Technique	تکنیک
Stanza	استنزا	Romance	رومان
Propaganda	پروپیگنڈا	Sonnet	سانیٹ
Mechanical	میکانیکی	Position	پوزیشن

اور دوسرے وہ جو اُردو سے بالکل میل نہیں کھاتے ۔ ایسے الفاظ کے مترادف تلاش کرنے پڑینگے ۔

الفاظ اور عبارت کا ترجمہ کرنے کے لیے علیحدہ علیحدہ اصول ہیں ۔ الفاظ کا ترجمہ کرنے میں میری رائے میں مندرجہ ذیل اصول کو سامنے رکھنا ضروری ہے :—

(۱) ترجمہ صحیح ہونا چاہیے ۔

(۲) حتی الامکان عام فہم ہونا چاہیے ۔

(۳) سبک اور خوبصورت ہونا چاہیے ۔

ترجمے کا صحیح ہونا بہر حال ضروری ہے ، کیونکہ جو تصور اصل میں ہے وہ اگر نقل میں ادا نہیں ہوتا یا اصل کی سی شدت کے ساتھ ادا نہیں ہوتا تو ایسا ترجمہ کچھ زیادہ مفید نہیں ہو سکتا ۔

ترجمے کا حتی الامکان عام فہم ہونا بھی ضروری ہے ۔ اس لیے کہ اس کے بغیر ترجمے کا مقصد پورا نہیں ہوتا ۔ ترجمے کا مقصد تو یہ ہے کہ عوام کو ان تصورات سے روشناس کرایا جائے جو اصل میں موجود ہیں ۔ اگر ترجمے میں ایسے الفاظ استعمال کیے جائیں جن کے معنی معمولی تعلیم یافتہ طبقہ نہ جانتا ہو تو وہ ان تصورات کو کیا سمجھے گا ؟

ترجمے کے سبک اور خوبصورت ہونے کی شرط زیادہ تر جمالیات کے نقطۂ نگاہ سے ہے ۔ لیکن اس کا ایک عملی پہلو بھی ہے اور وہ یہ کہ بھدا یا بھاری بھر کم لفظ استعمال کرنے سے بیان میں اُلجھاؤ اور گرانی پیدا ہو جاتی ہے اور مطالب کے اظہار اور تفہیم دونوں میں دشواری ہوتی ہے لہذا ترجمے کا مقصد یوں بھی جیسا چاہیے پورا نہیں ہوتا ۔

ان تینوں شرائط پر برابر توجہ دینا مشکل ہے اور یہ ضروری نہیں کہ ہر لفظ کا ترجمہ سب شرطوں پر پورا اُترے ۔ مثال کے طور پر انگریزی کا لفظ Blast لیجیے ۔ اصطلاح میں اس لفظ کے معنی ہیں ''ہوا کا سخت جھونکا جو بم گرنے کے بعد چلتا ہے ۔'' اس میں اتنی طاقت ہوتی ہے کہ بعض اوقات عمارتیں تک گر جاتی ہیں ۔ ظاہر ہے کہ لفظ ''جھونکا'' اس سارے مفہوم کا متحمل نہیں ہو سکتا ۔ جھونکا اصل میں لفظ (Gust) کا ترجمہ ہے ۔ میں نے بہت سوچا لیکن ''ہوائی تھپیڑے'' کے سوا اور کوئی لفظ Blast کا مترادف نہیں مل سکا ظاہر ہے کہ یہ ترجمہ نہ تو سبک ہے اور نہ خوبصورت ، لیکن چونکہ باقی دو شرطوں پر پورا اُترتا ہے ، یعنی صحیح اور عام فہم ہے ، اس لیے مجبوراً اسی کو اختیار کرنا پڑا ۔

جہاں تک میں نے غور کیا ہے عربی کے مقابلے میں فارسی الفاظ اُردو دانوں کے لیے زیادہ عام فہم ہوتے ہیں ، اور سبک اور خوبصورت بھی زیادہ ہوتے ہیں ۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں :۔

فارسی	عربی	انگریزی
تپش پیما	مقیاس الحرارت	Thermometer
بلند آواز	مکبرالصوت	Loud-speaker
آتش کش	قاطع النار	Fire-extinguisher
پرواز	طیران	Flight
تراشہ	قطعہ	Cutting

لیکن یہ کوئی قاعدہ کلیہ نہیں ۔ بعض اوقات عربی ترجمے بھی نہایت سبک اور حسین ہوتے ہیں ، مثلاً :

معجل	Urgent	قاصد	Messenger
تقدیم یا تقدم	Priority		
استقلال یا تصدیق یا تصویب (محل استعمال کیمطابق)	Confirmation		
تلبیس	Camouflage	عکسی	Photography

کبھی کبھی عربی اور فارسی کی آمیزش سے بہت خوبصورت ترجمہ ہو سکتا ہے ، مثلاً

طیارہ بان	Pilot	طیارہ برو	Air-borne
خیر اندیش	Good-will		

یہ ضروری نہیں (اور کوئی اچھی بات بھی نہیں) کہ ہر لفظ کا لفظی ترجمہ کر دیا جائے ۔ اصل عبارت میں اکثر الفاظ ایسے ملتے ہیں جو ایک خاص ماحول رکھتے ہیں اور ایک خاص تلازمۂ خیال پیش کرتے ہیں ۔ اگر ترجمے میں آنکھ بند کرکے ان کے مترادف الفاظ رکھ دیے جائیں تو نتیجہ اکثر مضحکہ خیز ہوتا ہے ۔ مثلاً انگریزی لفظ Labour کا ترجمہ عام حالات میں محنت یا مشقت کرنا ٹھیک ہے لیکن کہیں اسپتال کے Labour-Room کو محنت یا مشقت کا کمرہ نہ کہہ دیجیے گا ۔ اسی طرح اگر I have to recruit about 500 labour کا ترجمہ آپ یوں کریں

کہ مجھے تقریباً ۵۰۰ محنت بھرتی کرنی ہے ، تو ممکن ہے آپ مترجم سمجھے جائیں لیکن معقول آدمی سمجھے جانے میں ذرا شک ہے ۔

الفاظ کا ترجمہ کرنا پھر بھی نسبتاً آسان ہے ، لیکن عبارت کا ترجمہ کرنا اکثر مشکل ہوتا ہے ۔ وجہ یہ ہے کہ اس میں دو متضاد تقاضوں سے واسطہ پڑتا ہے ۔ ایک طرف تو یہ خیال رکھنا پڑتا ہے کہ ترجمہ حتی الامکان تحت اللفظ ہو ، اصل عبارت کا محض لب لباب یا تبصرہ نہ ہو ، اور دوسری طرف ترجمے کی زبان کا محاورہ ہاتھ سے نہ جانے پائے ۔ ہر زبان میں مخصوص اسالیب ہوتے ہیں جن کا لفظی ترجمہ دوسری زبان میں نہیں ہو سکتا ۔ ایسی صورت میں یا تو ترجمے کی زبان کا کوئی ایسا اسلوب اظہار یا محاورہ تلاش کرنا پڑتا ہے جو اصل کا لفظی ترجمہ نہ ہو بلکہ اس کے مرکزی خیال کو ادا کرتا ہو ۔ یا اگر یہ ممکن نہ ہو تو پھر ترجمے میں جملے کی ساخت حسب ضرورت تبدیل کرنی پڑتی ہے اور یا الفاظ گھٹانے بڑھانے پڑتے ہیں ، تاکہ مطلب حتی الامکان صفائی اور محاورے کے ساتھ ادا ہو جائے ۔ مثال ملاحظہ کیجیے :۔

The common interests of mankind are numerous and weighty, but our existing political machinery obscures them through the scramble for power between different nations and different parties.

لفظی ترجمہ :۔

انسان کے مشترک مفادات کثیر اور وزنی ہیں ، لیکن ان کو ہماری موجودہ سیاسی مشینری مختلف قوموں اور جماعتوں کے کشاکش اقتدار کے ذریعہ دھندلا کر دیتی ہے ۔

با محاورہ ترجمہ جو حتی الامکان تحت اللفظ ہے :۔

انسان کے مشترک مفادات کثیر اور وزنی ہیں ، لیکن ہماری موجودہ سیاسی مشینری کچھ ایسی ہے کہ اس میں مختلف قوموں اور جماعتوں کے درمیان حصول اقتدار کے لیے کشاکش ہونا ضروری ہے ۔ اور یہ چیز اُن مفادات کی اہمیت گھٹا دیتی ہے ۔

اس ترجمے کی پہلی مثال صرف کہنے کو اُردو ہے ۔ معلوم ہوتا ہے کہ سولاہیٹ کو ترکی ٹوپی کے قالب پر زبردستی چڑھانے کی کوشش کی گئی ہے ۔ دوسری مثال میں کچھ الفاظ اپنی طرف سے بڑھائے گئے ہیں اور جملے کے آخری حصے کی ساخت کسی قدر بدل دی گئی ہے ۔ نتیجہ یہ ہے کہ دوسرا جملہ اُردو کا معلوم ہوتا ہے اور سمجھ میں بھی آسانی سے آتا ہے ۔

ہر زبان کے الفاظ میں ایک وزن اضافی ہوتا ہے ۔ بظاہر اکثر الفاظ ہم معنی نظر آتے ہیں اور ایک ہی لفظ کے کئی کئی معنے ہوتے ہیں ۔ لیکن گہری نظر ڈالنے سے ان الفاظ یا معانی میں نازک امتیازات قائم کیے جا سکتے ہیں بلکہ اکثر یہ امتیازات پہلے سے موجود ہوتے ہیں ۔ مثلاً ذیل کے الفاظ اُردو میں بظاہر ہم معنی ہیں ۔

عریاں ۔ برہنہ ۔ ننگا ۔

لیکن ان کے محل استعمال پر غائر نظر ڈالی جائے تو معلوم ہو گا کہ ان میں بہت فرق ہے ۔ لفظ ''برہنہ'' میں حقیقت اتنی بے لباسی نہیں ہے ۔ جتنی کہ لفظ ''ننگا'' میں ہے ، اور لفظ ''عریاں'' میں اس سے بھی کم ہے ۔ اگر کہا جائے کہ ''بچہ ننگا ہے'' تو یہاں اس لفظ کا استعمال بالکل با محل ہے ۔ خیال فرمائیے کہ ''بچہ برہنہ یا عریاں ہے'' کہنے میں کسقدر ثقل آعوذیت پائی جاتی ہے ! لیکن جب مرد یا عورت کا ذکر آئے گا تو بہ لحاظ حاجت ستر لفظ ''برہنہ'' یا ''عریاں'' استعمال کرنا بالکل درست ہو گا ۔ البتہ اگر پاگل مرد یا عورت کا معاملہ ہو تو اس کو عریانیت کا تیسرا درجہ دینے میں کوئی ہرج نہیں ۔ مطلق الفاظ کا ترجمہ ہو ، یا عبارت کا ، اس ''وزن اضافی'' کا خیال رکھنا بہت ضروری ہے ۔

ترقی یافتہ زبانوں کے جملے اکثر پیچیدہ اور لمبے ہوتے ہیں جس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے اسالیب مقرر اور عام فہم ہو چکے ہیں اور مطلب سمجھنے میں کوئی خاص دقت نہیں ہوتی لیکن اردو ابھی تک زیادہ پیچیدہ اور لمبے جملوں کی متحمل نہیں ہے ۔ لہذا ترجمہ کرنے میں ایسے جملوں کو

چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں تقسیم کر لینا بہتر ہوتا ہے اور یہ ٹکڑے مناسب حروف عطف کی مدد سے آپس میں جوڑے جا سکتے ہیں ۔ مثال

Provision will also have to be made for the construction of baffle walls designed to afford protection against the blast and splinter effects of a 500 lbs. General Purposes Bomb falling at a distance of not less than 50 feet.

انگریزی کا یہ جملہ باوجود اتنا لمبا ہونے کے **Simple** ہے ۔ **Compound** یا **Complex** نہیں ہے ۔ لیکن اُردو میں ترجمہ کرنے کے لیے اس کے دو ٹکڑے کر لینا مناسب ہو گا ، اس طرح۔

۵۰۰ پونڈ کے ایک ہمہ مقصد بم کے کم از کم ۵۰ فٹ پر گرنے سے جو ہوائی تھپیڑا پیدا ہوتا ہے اور پرخچے اُڑتے ہیں (حصہ نمبر ۱) اُن کے اثرات سے عمارات وغیرہ کو محفوظ رکھنے کے لیے حفاظتی دیواروں کی تعمیر کا بھی بندوبست کرنا ہو گا۔ (حصہ نمبر ۲)

ترجمہ کرنے میں اکثر یہ مشکل آ پڑتی ہے کہ بہ مقابلہ ترقی یافتہ زبانوں کے اردو میں اسم سے فعل اور فعل سے اسم بنانے کی سہولت تقریباً مفقود ہے ۔ مثال دیکھیے۔

The hygienic siting and spacing of new buildings in a crowded area presents a difficult problem.

اس جملے کا ترجمہ کرنے میں دشواری صرف یہ ہے کہ اُردو میں **Site** اور **Space** کے مترادفات تو موجود ہیں لیکن انہیں آسانی کے ساتھ **Siting** اور **Spacing** میں تبدیل نہیں کیا جا سکتا ۔ مجبوراً نئے الفاظ گھڑنے پڑیں گے چنانچہ میری کوشش ملاحظہ ہو ۔

گنجان علاقے میں نئی عمارات کی صحت مندانہ نہائش اور فصل آرائی ایک مشکل مسئلہ ہے ۔ اس جملے کا سیدھا سادہ ترجمہ یوں بھی ہو سکتا ہے ۔

گنجان علاقے میں نئی عمارتیں کہاں اور کتنے فاصلے پر بنائی جائیں ، یہ ایک مشکل مسئلہ ہے ۔

لیکن ایسا ترجمہ اُردو کے حق میں کچھ زیادہ مفید نہیں ہو سکتا کیونکہ Siting اور Spacing تشنۂ ترجمہ رہ جاتے ہیں ۔ اگر زبان کو وسیع بنانا ہے تو نئے الفاظ کے ترجمے سے گریز نہیں کرنا چاہیے بلکہ ترجمے میں بھی نئے الفاظ وضع کرنے چاہئیں ۔

سطور بالا سے عبارت کا ترجمہ کرنے کے لیے حسب ذیل اصول اخذ کیے جا سکتے ہیں :

(۱) ترجمہ حتی الامکان تحت اللفظ ہونا چاہیے ۔ اصل عبارت کا محض خلاصہ مطلب نہیں ہونا چاہیے ۔

(۲) ترجمہ حتی الامکان محاورہ زبان کے مطابق ہونا چاہیے ۔

(۳) الفاظ کے وزن اضافی کا خیال رکھنا چاہیے تاکہ اصل عبارت میں ان کی جو اضافی اہمیت ہے وہ ترجمے میں بھی باقی رہے ۔

(۴) حتی الامکان ایسے الفاظ کے ترجمے سے گریز نہیں کرنا چاہیے جن کے مترادفات اُردو میں پہلے سے موجود نہ ہوں ۔ زبان کو وسعت دینے کا طریقہ یہی ہے کہ جہاں تک ممکن ہو ۔ ہر لفظ کا مترادف تلاش کرنے کی کوشش کی جائے ، خواہ وہ مترادف نامانوس ہی کیوں نہ ہو ۔

(۵) اصل عبارت میں جملہ اگر اس قدر پیچیدہ اور لمبا ہو کہ اس کا تحت اللفظ ترجمہ کرنے سے معنی میں الجھاؤ پیدا ہو جاتا ہو ، تو ایسی صورت میں جملے کو چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں تقسیم کر لینا چاہیے ۔

زیادہ غور کرنے سے شاید اور اصول قائم کیے جا سکیں ۔ لیکن موٹے موٹے اصول یہی ہیں ۔

ترجمہ ، تالیف ، تلخیص اور اخذ کرنے کا فن[1]

بہتر ہو گا کہ اس مضمون کی حدود کا شروع ہی میں ذکر کر دیا جائے ۔ اس تحریر کا مقصد نہ تو اردو میں تراجم کا تاریخی جائزہ پیش کرنا ہے اور نہ ہی انفرادی طور پر مختلف تراجم کا تجزیہ مقصود ہے ۔ یہ مضمون براہ راست ترجمے کے نظری مباحث سے منسلک ہے اور اس کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ ترجمے کے جواز ، اس کی اہمیت اور مختلف ترجمہ کرنے والوں کے عمومی رجحانات کا جائزہ لیا جائے ۔ اس سلسلے میں ایک دوسری حد بندی یہ کی گئی ہے کہ صرف تخلیقی ادب کے تراجم کا ذکر کیا گیا ہے ۔ صحافتی ترجمہ ، فلسفہ ، نفسیات اور دوسرے علوم کے ترجمے اس مضمون کے دائرے سے باہر سمجھے گئے ہیں ۔ یہ اور بات ہے کہ عمومی طور پر ترجمے کے بارے میں بیان کی گئی بعض باتیں ان چیزوں کے تراجم پر بھی منطبق کی جا سکتی ہیں ۔ ترجمہ کرنے والوں کو سب سے پہلا سوال تو خود سے یہی کرنا چاہیے کہ ترجمے کا جواز یا اس کی اہمیت کیا ہے ۔ اگرچہ خود تخلیقی ادب کے نمائندے بھی اکثر صورتوں میں اپنی تخلیق کے جواز سے باہر نہیں ہوتے اور تحریک تخلیق کے دباؤ کے تحت ادب تخلیق کرتے ہیں ۔ محمد حسن عسکری کے لفظوں میں "سچا فن کار ستارے ڈھونڈنے نہیں نکلتا اس کے لیے اس کا بادبان ہی ستارہ ہے ۔ فن کار فن کی تخلیق پر مجبور ہے یہ اس کی کوئی باطنی ضرورت ہے ۔ اس بنیادی سچائی کو آپ مختلف نفسیاتی ، عمرانی یا جمالیاتی اصطلاحوں میں بیان کر سکتے ہیں اس سے اس کی سچائی ختم نہیں ہوتی ۔ ترجمہ چونکہ تخلیق سے علیحدہ چیز ہے اور انسان شعوری طور پر کسی متن کو اپنی زبان میں منتقل کرتا ہے اس لیے

---

۱ ۔ مطبوعہ ماہنامہ کتاب لاہور جون ۸۲ء صفحات ۲۱-۲۶

ترجمے کا جواز عموماً جو سمجھا جاتا ہے ۔ یوں اگر دیکھیں تو یہ جواز خود تراجم کے اندر موجود ہوتا ہے مثلاً آپ نے دیکھا ہو گا کہ پابندیوں کے خلاف زمانے میں ایسے افسانوں اور ایسی نظموں کے تراجم زیادہ ہونے لگتے ہیں جن میں پابندیوں کے خلاف باغیانہ لہجہ یا جبر کا احساس نمایاں ہو ۔ ایسی صورت میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ بہت سے ادیبوں کی یہ روحانی ضرورت بن گئی ہے یا وہ شعوری طور پر تہذیبی اور سماجی صورت حال کے پیش منظر میں ایک خاص نوع کی تخلیقات سے دل چسپی لینے پر مجبور ہیں وہ باتیں جو خود نہیں کر سکتے انہیں ترجموں کی زبان سے ادا کر رہے ہیں ۔ اس طرح کے تراجم خود ان ادیبوں کے گرد کھڑے جبریت کے حصار کو کسی حد تک توڑتے ہیں اور قاری بھی صورت حال کے بعض کوائف کو ان میں پہچان کر ایک حد تک ان کے ذریعے جبر و احتساب کی فضا سے نکل آتا ہے ۔ اس لحاظ سے ان تراجم کا جواز اصل تخلیقات کے بعض موضوعات میں پوشیدہ ہوتا ہے ۔ اس جواز کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا تاہم یہ واضح کرنا ضروری ہے کہ یہ ترجمے کا لازمی یا اکلوتا جواز نہیں بعض ادبی حلقے اس چیز کو ترجمے کا واضح جواز سمجھتے ہیں اور یہ خیال کرتے ہیں کہ جو ترجمے یہ جواز نہیں رکھتے وہ سرے سے غیر ضروری ہیں ۔ یہ بالکل خاص طریق کار ہے جس طرح ادب پوری انسانی زندگی اور جذبوں اور افکار کی ہمہ گیر شکلوں کا احاطہ کرتا ہے ۔ اسی طرح ترجمہ بھی صرف چند جذبوں اور انسانی زندگی کی چند صورتوں تک محدود نہیں رکھا جا سکتا اسی سلسلے میں ترجمے پر ایک اعتراض یہ ہوتا رہتا ہے کہ اس کے ذریعے بعض مضر قسم کے اثرات ہماری تہذیبی زندگی پر رونما ہو سکتے ہیں ۔ اس اعتراض میں بھی کچھ سچائی ہو سکتی ہے مگر جس طرح کی حفاظتی دیوار ادب کے چاروں طرف کھڑی کرنے کی کوشش کی جاتی ہے کیا وہ معاشرے کے دوسرے شعبوں کے لیے کوئی معنی نہیں رکھتی ۔ پھر ایک سوال یہ بھی ہے کہ اس طرح کی مصنوعی دیوار موجودہ دنیا میں کتنے دن کھڑی رہ سکتی ہے ۔ اگر کسی معاشرے کی تہذیبی بنیادیں مضبوط ہیں تو وہ باہر سے آنے والے اثرات کا تجزیہ کرکے ان کو اپنی تہذیبی اوضاع کے معیار پر

پرکھ کر رد یا قبول کر سکتا ہے صرف خطرے کا اعلان کرکے ان خطرات کے نفوذ سے بچا نہیں جا سکتا ۔ یہ ضروری ہے کہ باہر سے آنے والے افکار کا تجزیہ ہوتے رہنا چاہیے مگر اس کے لیے جس علمی ریاضت کی ضرورت ہوتی ہے اس سے آنکھیں چرا کر سطحی الزام تراشی میں عافیت تلاش کی جاتی ہے ۔ اس پس منظر کی طرف اشارہ اس لیے ضروری تھا کہ ترجمہ کرنے والے اپنے منصب کے بارے میں خود بھی سوچیں اور اپنی کاوشوں کا تہذیبی پس منظر میں بھی ادراک کریں ۔

ہمارے ہاں ایسے لوگوں کی بھی کمی نہیں جو ترجمے کو اپنی زبان کے ادب میں ایک غیر فطری سا اضافی عنصر سمجھتے ہیں اور اس حقیقت سے بے خبر ہیں کہ ترجمہ ہمارے ادب کے خمیر میں شامل ہے ۔ تخلیق ادب کی عظمت کو تسلیم کرنا ضروری ہے مگر یہ کہنے سے تخلیق ادب کی عظمت کی نفی نہیں ہوتی کہ تخلیقی ادب کی بہت سی اعلیٰ شکلوں کے پیچھے ترجمے یا اخذ شدہ چیزوں کی چمک بھی موجود ہے ۔ ہم میں سے کتنے لوگ اس حقیقت کا شعوری طور پر احساس رکھتے ہیں کہ کلاسیکی اردو نثر کا بیشتر سرمایہ تراجم یا اخذ شدہ تحریروں کی ذیل میں آتا ہے ۔ ''باغ و بہار'' ہو یا ''بوستان خیال'' کے دائرے کی داستانیں یا ''داستان امیر حمزہ'' ''آرائش محفل'' بتیال پچیسی'' ''مذہب عشق'' ''سنگھاسن بتیسی'' غرض کہ ہمارا قابل قدر نثری سرمایہ اخذ یا ترجمے کی شکل میں ہے البتہ اس وقت کی تہذیبی فضا میں ترجمہ کرنے والے کے لیے آزادی یہ تھی کہ وہ قصہ بیان کرتے وقت بہت سی چیزوں کا اپنی طرف سے اضافہ بھی کر سکتا تھا ۔ بہر حال یہ اور اس طرح کی مشہور نثری تصانیف جو در اصل تراجم ہی ہیں اسی شاندار اسلوب میں لکھی گئی ہیں کہ اردو کے نثری اسالیب کا عظیم ترین معیار بھی یہی ہیں ۔ اردو ناول کے ابتدائی نمائندوں نذیر احمد ، سر شار اور شرر کے ہاں بھی اخذ شدہ مواد بہت ہے ۔ شاعری میں آزاد اور حالی کی جدید شاعری بھی اسی رجحان سے پھوٹی ۔ افسانے کے ابتدائی نمائندوں میں سجاد حیدر یلدرم کی ''خیالستان'' کا بیشتر مواد ترکی ادب سے ماخوذ ہے ۔ جدید اردو افسانے کے قارئین اس بات سے تو

تو باخبر ہی ہوں گے کہ سعادت حسن منٹو کی ابتدائی شہرت روسی اور فرانسیسی افسانوں کے تراجم سے ہوئی ۔ ظاہر ہے یہ مثالیں صرف عمومی اثر قبول کرنے کی نہیں براہ راست اخذ و ترجمہ سے متعلق ہیں ۔ اس طرح ہم دیکھ سکتے ہیں کہ ترجموں کا دھارا ہمارے ادب کی کھیتیوں کو کس کس طرح سیراب کرتا رہا ہے ۔

اب کچھ باتیں ترجمہ کرنے والے کے مزاج کے بارے میں۔ترجمہ خود پسندی کی کوکھ سے پیدا نہیں ہوتا یہ اور بات ہے کہ ہمارے ہاں بعض اوقات ادیبوں کی نرگسیت انہیں تراجم کی طرف مائل کرتی ہے مگر اصولی طور پر ترجمہ نرگسیت اور خود پسندی کی ضد ہے کیونکہ ترجمہ کسی دوسرے شخص کی تخلیق سے رابطہ قائم کرنے کا نام ہے اسی بات کو اردو میں یوسس کے مترجم محمد سلیم الرحمٰن نے ایک مرتبہ یوں کہا ہے کہ ترجمہ کرنے والے کے مزاج میں اطاعت ہونی چاہیے ۔ ظاہر ہے متن کی اطاعت قبول کیے بغیر اچھا ترجمہ کیسے ہو سکتا ہے گو بہت سے مترجم ایسے بھی ہیں جو متن کے کان مروڑ کر بھی عمدہ ترجمہ کر لیتے ہیں (یہ مثالیں آگے چل کر آئیں گی) مگر بنیادی طور پر اطاعت اور وفاداری کا اصول مترجم کی سرشت میں ہونا چاہیے اور شروع میں تو لازمی طور سے ہونا چاہیے ۔ انکساری تو ہر ادبی کام کے لیے ضروری ہے مگر ترجمہ کرنے والا تو اس کا جیتا جاگتا ثبوت ہے کسی دوسرے کی تخلیق کو اپنی زبان میں منتقل کرنا ایک طرح کی انکساری ہی ہے ۔ ترجمہ کرنے والے کا اصل مقصد ادبی اسالیب میں تازگی پیدا کرنا یا کسی دوسری زبان کے کسی شاہکار کو اپنی زبان میں منتقل کرنا ہے اپنے آپ کو نمایاں کرنا نہیں ہاں یہ کاوش از خود اس کو بھی کسی انداز سے نمایاں کر دے تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں ۔ صحیح ادبی مترجم خود کو گمنامی کے لیے بھی تیار رکھتا ہے ۔ روایتی تہذیبوں میں توشہ کاروں پر فن کاروں کے نام تک نہیں ہوتے تھے ۔ ہماری ادبی تاریخوں میں بھی ترجمہ نگاروں کو چاہے زیادہ جگہ نہ دی گئی مگر اکثر انہی کی کاوشوں سے ان فنکاروں کی بنیاد اٹھی جن کے ذکر سے یہ تاریخیں بھری ہوئی ہیں ۔ حقیقت پسند افسانے کے ساتھ ساتھ

جو افسانوی تراجم ہوئے ان میں سے اکثر ترجمہ کرنے والے جیسے عبدالقادر سروری ، پروفیسر مجیب جلیل قدوائی ، خواجہ منظور حسین کے نام اب کم ہی لوگوں کو یاد ہوں گے مگر ان لوگوں کا اصل مقصد یہ تھا کہ اردو افسانے کے لیے عمدہ نمونے فراہم کیے جائیں تو کون کہہ سکتا ہے کہ انہیں اپنے مقصد میں ناکامی ہوئی بلکہ میں تو بعض اوقات یہ سمجھتا ہوں کہ آج کل جدید علامتی افسانہ جس طرح چند برسوں ہی میں بعض اسالیب سے ٹکرانے لگا ہے کہیں اس کا ایک سبب یہ تو نہیں کہ اس کے متوازی اس طرح کے افسانوں کے ترجمے کی کوئی مضبوط روایت موجود نہیں اس کا یہ مطلب نہیں کہ تخلیقی فن کار خود باہر کے اچھے افسانہ نگاروں کو پڑھ نہیں سکتے ۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ترجمہ کرنے والے اس طرح کی تخلیقات کے لیے فضا ہموار کر دیتے ہیں ورنہ حقیقت پسند افسانہ نگار بھی ترجمے پڑھ کر ہی افسانے تو نہیں لکھتے تھے ۔

مترجم کے مزاج کے بارے میں آخری بات یہ کہ اسے اس زبان پر مہارت ہونی چاہیے جس سے وہ ترجمہ کر رہا ہے اور خود اپنی زبان پر بھی ۔ یہ بہت بیش بہا ، افتادہ ، متنوع اسالیب سے واقف ہو تاکہ ہر قسم کے اسلوب کے لیے کوئی متبادل اسلوب تلاش کر سکے ۔ بہت سے ترجمہ کرنے والے ایک سے ہوتے ہیں اور ہر اسلوب کو اپنے بنے بنائے سانچے میں ڈھال دیتے ہیں ۔ اس طرح کے ترجموں میں گھٹن پیدا ہوتی ہے اور مدتوں کے بند کمروں کی سی فضا ان میں رچ جاتی ہے ۔ مترجم اس صورت میں کامیاب ہو سکتا ہے جب کسی خاص اسلوب کے لیے ایسا پیرایہ استعمال کرے جو اس کے لیے موزوں ہو ۔ میرا جی نے ایڈگرایلن کی نظموں کے جو تراجم کیے ہیں ان کے اسلوب کی وضاحت کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں ۔

> ”اس مضمون کے ساتھ ساتھ جو ترجمے دیکھیں گے ان میں سے اکثر میں ہندی بحر استعمال کی گئی ہے جو فارسی میں نہ تھی لیکن اردو والوں نے ہندی سے لے کر اپنا لی ۔ یہ ڈھیلی ڈھالی بحر (جس میں ضرورت کے وقت ایک تیزی بھی پیدا کی جا سکتی

ہے) نہ صرف موسیقی گیتوں کے لیے بہت موزوں ہے بلکہ خواب دیکھنے والی طبائع سے ایک فطری مناسبت رکھتی ہے چنانچہ میر تقی میر کی اکثر غزلوں میں (اور اچھی غزلوں میں خصوصاً) آپ اسی بحر کو پائیں گے پھر ترجموں میں بھی اسی بحر کا زیادہ استعمال ہونا اس کی خواب آلود ذہانت کی نسبت سے ہے۔"

دھیرے، دھیرے، دھیرے، دھیرے، جیون ندی بہتی جا۔

ممکن ہے کوئی دوسرا مترجم "ہو" کی نظموں کے لیے کوئی دوسری بحر منتخب کر لے مگر دیکھنے کی اصل چیز یہ ہے کہ میرا جی نے ہو کی خواب آلود ذہانت کی مناسبت سے بحر منتخب کی ہے۔ یہ چیز بھی عیاں ہے کہ اگر کوئی دوسرے انداز کا شاعر ہو تو اس لیے اسلوب بھی اسی انداز کا لانا ہوگا۔ ظ انصاری نے پوشکن کی نظموں کے جو تراجم کیے ہیں ان میں اردو کے مختلف شعری اسالیب سے ان کی واقفیت کس طرح مددگار بنی ہے اسے آپ خود دیکھ سکتے ہیں۔

کہیں غالب کا اسلوب کام آیا کہیں نظیر کا۔ کہیں مثنوی نگار شعراء کا اور کہیں فیض کا۔ نثری ادب سے بھی ایک مثال پیش کرتا ہوں۔ محمد حسن عسکری نے میلول کے ناول موبی ڈک کا جو ترجمہ کیا ہے اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ وہ انگریزی کے ساتھ اردو کے مختلف نثری اسالیب سے کتنی گہری واقفیت رکھتے تھے اس ناول میں بے شمار اسالیب گلے ملے ہیں اور عسکری صاحب نے بھی اردو کے اتنے اسالیب گھلا ملا دیے ہیں کہ خوش گوار سی حیرت ہوتی ہے ریڈ انڈین کے دور کے لیے جو اسلوب منتخب کیا گیا اور اسے جس طرح پورے ترجمے میں نبھایا گیا ہے دیکھنے کی چیز ہے۔ اس ناول کا ایک باب ہے جس میں مختلف قوموں کے جہازی، جہاز کے عرشے پر شور مچاتے دکھائے گئے ہیں۔ صرف اسی باب کو دیکھ لیجیے اس میں مختلف قوموں کے ملاحوں کی رعایت سے کتنے اسالیب گھلا ملا دیے گئے ہیں۔ موبی ڈک کے ترجمے سے بہتر نثر جدید دور کے کسی اردو ناول میں مشکل ہی سے ملے گی مگر میرا وہ زمانہ نہیں اور اب ترجمے کا خانہ الگ ہے اس لیے اس نثر کے بارے میں اتنی توجہ

نہیں ہوئی اسی طرح عسکری صاحب کا "مادام بوداری" کا ترجمہ جس میں فلابیر کے اسلوب کو اردو میں منتقل کرتے ہوئے عموماً ایک طرح سے بہت بڑے چیلنج کو قبول کیا گیا ہے۔

حصہ دوم

اب ترجمے کی کچھ عملی دقتوں کی طرف بھی اشارہ ہونا چاہیے۔ ایک بات تو یہی ہے کہ ترجمے کے لیے کیا منتخب کیا جائے۔ اول تو یہ محبت کے تجربے کی طرح ایک داخلی تجربہ ہے۔ کوئی چیز آپ کے باطن کو گرفت میں لیتی ہے تبھی آپ اس کے ترجمے کی طرف مائل ہوتے ہیں۔ ہاں بعض اوقات کوئی ادارہ یہ ترجمہ کرواتا ہے مگر ہمارے ہاں ایسے ادارے بہت کم ہیں اس لیے اکثر ترجمہ کرنے والے اپنے انتخاب ہی سے کسی چیز کا ترجمہ کرتے ہیں بعض اوقات سیاسی اور تہذیبی صورت حال بھی اس انتخاب میں کوئی کردار ادا کرتی ہے۔ قیام پاکستان کے بعد ہندی کی چیزوں کا ترجمہ بہت کم ہوا ہے اس کی وجہ یہی ہے کہ ہندوستان سے ہمارے تعلقات درست نہیں تھے یا پچھلے چند برسوں میں عربی ادب کی طرف اور فلسطینی شاعروں کے کلام کی طرف کچھ توجہ ہوئی ہے اس کی وجہ بھی یہی ہے کہ ہم تہذیبی سطح پر ان سے کوئی رشتہ محسوس کرتے ہیں۔ آر سی ڈی کے زمانے میں کچھ ترک شاعر بھی ہمارے ہاں ترجمہ ہو گئے۔ اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ تہذیبی صورت حال بھی کسی نہ کسی شکل میں ہمارے انتخاب میں دخیل ہو جاتی ہے۔ بعض ترجموں کا تعلق ادبی اسالیب سے ہوتا ہے اگر ہمارے ادب میں ایک اسلوب ابھرتا ہے تو اس اسلوب سے دلچسپی لینے والے شاعر اس اسلوب کی بعض غیر ملکی چیزوں کے تراجم سے اپنے اسلوب کا جواز بھی مہیا کرتے ہیں اور بعض اوقات ان ترجموں کے حوالے سے اسالیب میں وسعت پیدا ہو جاتی ہے۔ اب شاعری کے ترجمے کے سلسلے میں بڑے بڑے شاعروں اور ادیبوں کے بعض خوف زدہ کرنے والے اقوال ہیں۔ ڈانٹے، سردانتیں، سیموئیل، جانسن اور وکٹر ہیوگو نے ترجمے بالخصوص شاعری کے ترجمے کو تقریباً نا ممکن بتایا ہے اس میں شک نہیں کہ شاعر کا جوہر زبان سے گہرے انداز سے

وابستہ ہوتا ہے اور یہ بات آخری حقیقت کے طور پر تو درست ہے لیکن اس سے یہ نتیجہ نہیں نکلتا کہ ترجمہ نہ کیا جائے اگر ترجمہ نہ ہوتا تو خود ڈانٹے یا سرداتیں کی عظمت کا کچھ نہ کچھ احساس دوسری زبانوں کے قارئین پر کیونکر ہوتا ۔

شاعری کے ترجمے کے سلسلے میں ایک بنیادی مسئلہ یہ بھی ہے کہ اسے نثر میں ترجمہ کیا جائے یا شاگردی ہی میں اور اگر شاعری میں ترجمہ ہو تو کس اسلوب میں ہو ۔ اگر شعر کا ترجمہ نثر میں کیا جائے تو سپاٹ ہو جانے کا خطرہ سر پر منڈلاتا رہتا ہے اور شعر کے شعر میں ترجمے کی صورت میں اکثر مصنوعی یا مشینی انداز کی کاوش کا شک گزرتا ہے ۔ اس سلسلے میں یہ چیز بھی ذہن میں ہونی چاہیے کہ ترجمے کی کئی جہتیں ہو سکتی ہیں ۔ ایک جہت تو یہ ہے کہ کسی علاقائی زبان یا کسی ایسی زبان سے ترجمہ کرتے ہیں جو تہذیبی طور پر ہم سے قریب ہے مثلاً فارسی ۔ اس سلسلے میں میرا تاثر یہ ہے کہ ایسی زبانوں سے شعر کا ترجمہ زیادہ تر نثر میں ہو تو بہتر ہو گا ۔ متن کے مشکل الفاظ حل کر دیے جائیں اور شعر کا ترجمہ اچھی نثر میں دے دیا جائے تو قاری اس سے زیادہ بہتر انداز میں لطف اندوز ہو سکتا ہے ورنہ بالعموم دیکھا گیا ہے کہ علاقائی زبانوں کے عظیم شاعر اردو نظم کے روپ میں ترجمہ ہو کر اردو کے دوسرے درجے کے غزل گو معلوم ہونے لگتے ہیں ۔ جہاں تک فارسی کا تعلق ہے اس کے سلسلے میں تو یہ چیز باقاعدہ منصوبہ بندی کے تحت ہونی چاہیے ، عطار ، رومی ، نظامی ، خسرو ، جامی ، بیدل کی مثنویوں کے اردو نثر میں تراجم ہو جائیں تو اردو کے نئے ادیب اپنے تہذیبی سرمائے سے گہری دلچسپی لے سکتے ہیں ۔ ن ۔ م راشد نے جدید فارسی شاعروں کے تراجم نثر میں کیے ہیں اور بہت کامیاب ہیں ظاہر ہے اس تمام بیان سے منظوم تراجم کی نفی نہیں ہوتی مگر قریبی زبانوں کی شاعری کو کسی نئے قالب میں منظوم کرنا بہت محنت طلب کام ہے ۔ تراجم کی دوسری جہت ان زبانوں کے تراجم کی ہے جو تہذیبی طور پر ہم سے دور ہیں ۔ عملی طور پر اس سے مراد انگریزی سے ترجمہ ہے کیونکہ ہمارے ہاں دوسرے یورپی

زبانوں سے واقفیت رکھنے والے بہت کم لوگ ہیں اور دوسری زبانوں کا ادب بھی ہم عموماً انگریزی کی وساطت سے ترجمہ کرتے ہیں ۔ ان تراجم کے سلسلے میں البتہ میرا تاثر یہ ہے کہ ان زبانوں سے منظوم تراجم ہونے چاہئیں کیونکہ اس طرح کچھ ایسے اسالیب ہاتھ آنے کی توقع ہو سکتی ہے جو جدید نظم کے قالب میں ڈھل کر اسے وسعت بخش سکیں مگر اس میں بڑی ہے محنت زیادہ ۔ تو چلیے نثری تراجم ہی سہی مگر یہ کیا کہ آج کل ہر کوئی نثر میں ترجمے کی طرف ہی مائل ہے شاید اس کی ایک وجہ یہ ہو کہ آج کل نثری نظم کا چرچا ہے اور نثری نظم کے شاعر اپنے تجربوں سے مماثل چیزیں اردو میں منتقل کرنا چاہتے ہیں اور یقیناً یہ رجحان ہماری نثری نظم میں کچھ وسعت پیدا کر سکتا ہے مگر اس محدود جواز سے منظوم تراجم کی اہمیت کم نہیں ہوتی ہاں یہ ضرور ہے کہ مصنوعی بناوٹ اور جھوٹی زیبائش نثری نظم کا سپاٹ لہجہ بھی ہمیں کچھ زیادہ مزا نہیں دے سکتا ۔ اس کے ساتھ ہی یہ بھی دیکھا جا رہا ہے کہ نثر بالخصوص ناول کا ترجمہ ہمارے ہاں بہت کم ہو گیا ہے اس کی ایک وجہ تو ترجموں کے لیے مناسب اداروں کا نہ ہونا ہی ہے مگر اس کا کچھ تعلق عام ترجمہ کرنے والوں کی صلاحیتوں سے بھی ہو گا ۔ اسی طرح ڈرامے کا ترجمہ ہمارے ہاں کیوں بہت کم ہو رہا ہے یہ بھی سوچنے کی چیز ہے ۔ ترجمے کرنے کے لیے متن کے انتخاب کے ساتھ اس کے لیے مناسب اسلوب کا تعین بھی بنیادی اہمیت رکھتا ہے ۔ خود ایک زبان ہی میں اسالیب کا اتنا تنوع ہوتا ہے کہ ترجمہ کرنے والے کو یہ مشکل پیش آتی ہے کہ وہ کس اسلوب کو چنے ۔ مثلاً ایک ہی چیز ہندی آمیز اسلوب میں بھی ترجمہ ہو سکتی ہے ، فارسی آمیز اسلوب میں بھی ایک ہی چیز کو پابند نظم کا قالب بھی دیا جا سکتا ہے اور آزاد نظم کا بھی ۔ ظاہر ہے کہ ترجمہ کرنے والا اصل متن کے اسلوب کو جس حد تک گرفت میں لے گا ۔ اس کے تہذیبی سیاق و سباق کو جس حد تک سمجھے گا مصنف کے مزاج کو جس حد تک پہچانے گا اس حد تک وہ اس کے لیے مناسب اسلوب بھی چن سکے گا ۔ ہمارے ہاں اس سلسلے میں ترجمہ کرنے والے کی ذمہ داری

اس لیے بھی بڑھ جاتی ہے کہ اردو میں کسی چیز کا عموماً ایک ہی ترجمہ ہوتا ہے اور پھر مدتوں تک اس پر انحصار کرنا پڑتا ہے۔ متن کا تعلق جس صنف سخن سے ہو اس کے تقاضوں کا لحاظ بھی رکھنا پڑتا ہے۔ شاعری کا ترجمہ کچھ مخصوص تقاضے کرتا ہے ناول اور افسانے میں یہ تقاضے کچھ مختلف ہو جائیں گے اور ڈرامے میں ان کی نوعیت کسی حد تک تبدیل ہو جائے گی۔

ہر زبان کی طرح اردو میں بھی مختلف انداز کے ترجمے ہوئے ہیں۔ زیادہ تعداد تو انہی تراجم کی ہوتی ہے جو متن سے تو ایک حد تک وفادار ہوتے ہیں مگر ان کے ذریعے اردو کے اسالیب بیان میں کوئی اضافہ نہیں ہوتا۔ بعض تراجم ایسے ہوتے ہیں جو متن سے وفادار بھی ہیں اور اردو کے اسالیب میں بھی ان کے ذریعے کچھ تنوع پیدا ہوا۔ اکبر الہ آبادی، ظفر علی خان پھر بالخصوص مولوی عنایت اللہ کے ترجمے اور دور جدید میں محمد سلیم الرحمان کا ہومر کی اوڈیسی کا ترجمہ "جہاں گرد" کی واپسی ایسی چند مثالیں ہیں۔

ترجمہ کرنے والوں میں سے بعض ایسے ہیں جو متن کی پروا ایک حد تک ہی کرتے ہیں مگر اپنی زبان میں ایک طاقتور اسلوب پیدا کر دیتے ہیں جس کا اثر بہت دور تک جاتا ہے۔ ایذراپاؤنڈ نے اسی طرح کے ترجمے کو ادب کے لیے سب سے کارآمد قرار دیا ہے اور محمد حسن عسکری بھی اسی کو تخلیقی ادب کے لیے با معنی قرار دیتے ہیں۔ چونکہ ایسے تراجم میں ترجمہ کرنے والا ایک نیا قالب بنانے کے لیے بہت کچھ اپنی طرف سے بھی شامل کر دیتا ہے۔ اس لیے بعض نقاد اس کے لیے "توضیحی ترجمے" کی اصطلاح استعمال کرتے ہیں۔ اردو میں نادر کاکوروی اور میراجی کے بعض تراجم اس کی مثال ہیں۔ مثلاً نادر کاکوروی کا ایک مشہور ترجمہ ہے "گزرے زمانے کی یاد" یہ ٹامس مور کی نظم THE LIGHT OF OTHER DAYS کا ترجمہ ہے۔ اس نظم کا پہلا بند دیکھیے۔

Oft, in the stilly hight
Eve Slumber's chair has bound me ?
Fond memory brings the light

of other days around me :
The smiles, the tears
of boyhood's years
The words of love then spoken,
the eyes that shone
Now dimn'd and gone,
The cheerful hearts now broken ;
Thus, in the stilly night
Eve slumber's chair has bound me,
Sad memory brings the light
of other days around me.

اس کا ترجمہ دیکھیے اور یہ بھی کہ نادر کاکوروی نے اپنی طرف سے کیا کچھ شامل کر دیا ہے۔

اکثر شب تنہائی میں
کچھ دیر پہلے نیند سے
گزری ہوئی دل چسپیاں
بیتے ہوئے دن عیش کے
بنتے ہیں شمع زندگی
اور ڈالتے ہیں روشنی
میرے دل صد چاک پر
وہ بچپن اور وہ سادگی
وہ رونا وہ ہنسنا کبھی
پھر وہ جوانی کے مزے
وہ دل لگی وہ قہقہے
وہ عشق وہ عہد وفا
وہ وعدہ اور وہ شکریہ

وہ لذت بزم طرب
یاد آتے ہیں ایک ایک سب
دل کا کنول جو روز و شب
رہتا شگفتہ تھا سو اب
اس کا یہ ابتر حال ہے
اک سبزہ پامال ہے
اک پھول کملایا ہوا
ٹوٹا ہوا بکھرا ہوا
روندا پڑا ہے خاک پر

متن سے زیادہ قریب نہ ہوتے ہوئے بھی اس ترجمے کا جادو آج تک سر چڑھ کر بول رہا ہے بعد میں جب میرا جی نے ٹامس مور کی نظموں کے تراجم کیے تو اس نظم کے لیے نادر کاکوروی ہی کے ترجمے کو درج کیا۔ نظم طباطبائی کے مشہور ترجمے "گور غریباں" کی بھی یہی کیفیت ہے۔ اس طرح کے تراجم خود اس زبان کے قالب میں حل ہو کر اس کا حصہ بن جاتے ہیں مگر خود نادر کے بھی اس ترجمے کے علاوہ کتنے ترجموں کو یہ درجہ نصیب ہوا۔ اس طرح کے ترجمے کی اصل خوبی اس کا جیتا جاگتا اسلوب اور اس کے اندر دوڑتا ہوا لہو ہوتا ہے۔ فٹزجیرالڈ نے عمر خیام کی رباعیات کا جو ترجمہ کیا اس کی شہرت بے پناہ ہے حالانکہ اس میں متن سے زیادہ وفاداری نہیں کی گئی۔ موجودہ دور کے ایک اور مشہور انگریزی شاعر رابرٹ گریوز نے فٹزجیرالڈ کے ترجمے پر عدم اطمینان کا اظہار کیا اور اپنا ترجمہ پیش کیا۔ یہ ترجمہ بھی اچھا خاصا ہے اور متن کے بہت قریب مگر اس میں وہ توانائی پیدا نہیں ہو سکی۔ ایک نقاد نے دونوں تراجم کا موازنہ کرتے ہوئے کہا کہ فٹزجیرالڈ کا ترجمہ ایک ننھی چڑیا ہے مگر یہ چڑیا زندہ ہے اور بسیط فضاؤں میں اڑ رہی ہے۔ رابرٹ گریوز کا ترجمہ بڑا سا عقاب ہے مگر مردہ جس میں بھس بھر کے ڈرائینگ روم میں رکھ دیا گیا ہو۔ اسی طرح ایک پروفیسر صاحب کو ایذرا پاؤنڈ کے چینی ادب سے تراجم قابل اعتراض نظر آئے۔ پاؤنڈ نے جگہ جگہ متن کا

حلیہ بگاڑ دیا تھا۔ پروفیسر صاحب نے اپنا ترجمہ پیش کیا ہے اور متن کے قریب رہنے کے شوق میں ساری تازگی اور شگفتگی کو ختم کر دیا۔ اقبال نے بعض انگریزی نظمیں اتنی خوبصورت اخذ کی ہیں کہ ان کی اپنی تخلیقات بن گئی ہیں۔ لوول کے مشہور اخذ شدہ تراجم اس کی اپنی نظمیں بن گئی ہیں۔ اسی طرح محمد حسن عسکری صاحب نے سرشار کے "خدائی فوجدار" کی مثال پیش کی ہے۔ ترجمے کے لحاظ سے یہ ناکامیاب ہے مگر سرشار نے ایسا نثری اسلوب پیدا کر لیا۔ اس کا اثر خود ان کے اپنے ناولوں پر بھی پڑا اور اس عہد کے دوسرے ناول نگار بھی اس سے متاثر ہوئے۔

ایذراپاؤنڈ اور عسکری صاحب کی پیروی میں میں بھی یہ سمجھتا ہوں کہ تخلیقی ادب کے لیے ایسا ترجمہ زیادہ بامعنی ہو سکتا ہے مگر ظاہر ہے کہ اس کے لیے پختہ کار ادیب ہی موزوں ہو سکتا ہے دوسرے اس کی حیثیت استثنائی ہوتی ہے۔ شروع میں تو اگر آدمی متن کے مفہوم ہی کو کامیابی سے اپنی زبان میں منتقل کر دے تو یہی بڑی بات ہے یوں بھی اعلیٰ فنی شہکار کئی متراجم کا تقاضا کرتے ہیں اور ایسے ترجمہ کی جو متن کو خوبی سے منتقل کرتا ہو ہر وقت گنجائش موجود ہوتی ہے۔

میں نے اس مضمون میں بنیادی مسائل کی وضاحت کی ہے اسلوب کے ضمنی مسائل کی بھی ترجمے میں بے حد اہمیت ہوتی ہے۔ آپ کی ذرا سی چوک آپ کے ترجمے کو مضحکہ خیز بنا سکتی ہے مثلاً کوئی خاص محاورہ جسے آپ لفظی طور پر ترجمہ کر دیں یا کسی جگہ کا نام جسے آپ کسی لڑکی کا نام سمجھ لیں، کسی دریا کا نام جسے آپ شہر کا نام فرض کر لیں اسی طرح عام بول چال کے لفظ بھی ہمیں طرح طرح کی مشکلات میں مبتلا کر سکتے ہیں۔ پھر علوم کی اصطلاحیں جن کے تراجم کے سلسلے میں ہم ابھی تک کسی حتمی نتیجے پر نہیں پہنچ سکے۔ اسی طرح مترادفات کا مسئلہ ہے۔ آپ ایک ہی لفظ کے لیے کھڑکی، دریچہ، غرفہ، روزن جیسے لفظوں میں سے کسی کو چنیں گے اس کا فیصلہ تو متن کی نوعیت کے اعتبار سے اور سیاق و سباق کے حوالے ہی سے ہو گا اور آپ کو بار بار لغت

بلکہ کئی لغات سے کام لینا ہو گا ۔ ایک مشہور مترجم سے میں نے اس کے ترجموں کی کامیابی کے بارے میں سوال کیا تو اس نے انکساری سے یہ کہا میں لغت دیکھ لیتا ہوں باقی لوگ اس کام میں بھی سبکی محسوس کرتے ہیں ۔

ریناتوپوگی اولی نے مترجمین کو ادب کی جمہوریہ کے سب سے زیادہ عالمی شہری قرار دیا ہے جن کی عدم موجودگی ادبی روایت کو آہستہ آہستہ بے حد محدود اور گوشے کے لفظوں میں ایک طرح کی اکتاہٹ کا شکار کر سکتی ہے اس لیے قصر ادب میں ترجمے کا دروازہ ہر وقت کھلا رہنا چاہیے اور ایسے لوگوں کی آمد پر خوش آمدید کہنا چاہیے جو مترجم کی ضمنی حیثیت کو قبول کرکے محنت کرنا چاہتے ہوں ان کی کاوشوں سے کتنے ہی نئے دروازے کھلنے کا امکان ہر وقت موجود رہتا ہے ۔

فن ترجمہ کے اصول و مبادیات[۱]

ترجمے کے بارے میں ''تاریخ زبان انگریزی'' کے مصنف البرٹ سی بش نے کہا ہے ''کہ کسی فن پارے یا ادبی تخلیق کے مافیہ کو ترجمے کے ذریعے کسی دوسری زبان میں منتقل کرنا ممکن نہیں کیونکہ ہر زبان کا اپنا مزاج ، اپنا آہنگ اور اسلوب و پیرایہ بیان ہوتا ہے ۔ علاوہ ازیں روزمرہ ، تشبیہات ، محاورات ، ضرب الامثال استعمارات و کنایات ، مخصوص معاشرتی ، معاشی ، تاریخی اور سیاسی زندگی کی نمائندگی اور تہذیب و تمدن کی عکاسی کرتے ہیں ۔'' اسی قسم کے خیالات کا اظہار گورنمنٹ کالج لاہور کے سابق پرنسپل ڈاکٹر لائٹز نے بھی کیا ہے اور یہ مشورہ دیا ہے '' کہ ہمیں ترجمے پر انحصار نہیں کرنا چاہیے بلکہ اصل مفہوم سمجھ کر اسے اپنی زبان میں بیان کرنا چاہیے ۔''

ڈاکٹر لائٹز کا بیان ترجمے کے بارے میں کچھ زیادہ واضح ہے ۔ یہ بجا ہے کہ کسی بھی زبان کا لفظی ترجمہ ممکن نہیں، لیکن مفہوم کا ترجمہ ایک ایسی شے ہے کہ اگر مناسب اسلوب کے ساتھ پیش کیا جائے تو تخلیق کا مقام پا سکتا ہے ۔

اچھا ترجمہ ہمیشہ تخلیقی ہوتا ہے

ایک اچھا ترجمہ ہمیشہ تخلیقی ہوتا ہے ۔ اس لیے کہ ترجمہ سے متبادل اور مترادف الفاظ کی تلاش کرنا نہیں بلکہ ان افراد کی رہنمائی مقصود ہوتی ہے جو دوسری زبان کو نہیں جانتے ۔ صاف ظاہر ہے کہ ایسے افراد کے لیے غیر زبان کے مفاہیم کو ان کی اپنی زبان اور اسلوب بیان میں بتانا پڑتا ہے اور یہ ایک اعتبار سے بازیافت کا عمل ہے ۔ اصل کو پڑھ کر اسے

۱۔ مطبوعہ اردو نامہ لاہور مارچ ۸۳ء (سالنامہ) ص ۳۱-۴۲

rekhta

ترجمے کی زبان میں اس کے روز مرہ اور محاورے کے مطابق بیان کرنا کسی تخلیق سے کم نہیں ہوتا ۔

مولانا ظفر علی خان کے ترجمہ ''معرکۂ مذہب و سائنس'' پر رائے کا اظہار کرتے ہوئے اچھے ترجمہ کی تعریف میں مولوی عبدالحق کچھ یوں رقم طراز ہیں :

''جن لوگوں نے فردوسی کی زندہ کتاب ''شاہنامہ'' کو پڑھا ہے انہیں جنگ سہراب و رستم کی دلکش داستان یاد ہوگی ۔ شاعر نے اس رزم کو اس خوبی اور لطف و فصاحت کے ساتھ بیان کیا ہے اور تخیل میں وہ شان پیدا کی ہے کہ بیان سے باہر ہے ۔ اسی طرح بلکہ اس سے زیادہ لطف و فصاحت کے ساتھ امریکہ کے نامور فاضل ڈاکٹر ڈریپر نے مذہب و سائنس کی رزم دکھائی ہے ۔ مصنف کا زور قلم اور تبحر شاعر کے تخیل کے قریب پہنچ گیا ہے ۔ اس مضمون پر بحث کرنے میں فاضل مصنف نے دنیا کے تمام علوم اور مذاہب اور انسانی فطرت پر ایسی غائر اور وسیع نظر ڈالی ہے کہ گویا دریا کوزے میں بند کر دیا ہے ۔ کتاب ختم ہو جاتی ہے لیکن جنگ ختم نہیں ہوتی ۔ پڑھنے والا سوچتا ہے کہ کیا یہ جنگ یونہی ٹھنی رہے گی ؟ کیا انسان اندھیرے میں اسی دھکڑ پکڑ اور دگدا میں رہے گا ؟ کیا وہ یونہی اندھیرے میں ٹامک ٹوئیاں مارتا رہے گا اور نور ہدایت کو کبھی نہ پہنچے گا ؟ میں اس موقع پر اس امر کا اظہار واجب سمجھتا ہوں کہ اس کتاب کا ترجمہ بھی ایسا ہوا ہے کہ اردو زبان میں یادگار رہے گا جہاں تک میرا علم ہے اردو زبان میں یہ پہلی کتاب ہے جس میں اصل کتاب کے زور اور فصاحت کو بعینہٖ قائم رکھا گیا ہے اس کتاب کے ترجمہ میں دو بڑی مشکلیں تھیں ۔ ایک تو علمی اصطلاحات و علمی مباحث دوسری زبان کی خوبی و فصاحت اور اردو کی بے بضاعت زبان میں ان دونوں کو قائم رکھنا بہت دشوار تھا

مگر مولوی ظفر علی خان صاحب نے جو درحقیقت قابل مبارک باد ہیں ، اس مشکل کو نہایت خوبی سے آسان کر دیا ہے لیکن یہ اس سے ہو سکتا ہے جس کے قلم میں اس قدر زور اور جسے زبان پر اس قدر قدرت ہو جیسی کہ فاضل مترجم کو حاصل ہے ۔''(۲)

آخر ترجمہ ہی کیوں ؟

جب ترجمہ اور تخلیق میں کوئی فرق نہیں رہنا چاہیے تو پھر ہم اسے ترجمہ ہی کیوں کہیں ، تخلیق کیوں نہ کہیں ۔ کسی بھی مفہوم کو اپنے انداز سے بیان کرنا تخلیقی حیثیت رکھتا ہے ۔ مترجم اس میں نہ کوئی تبدیلی کرتا ہے نہ ترمیم اور نہ اضافہ اس لیے ہم اسے ترجمہ ہی کہیں گے خواہ وہ تخلیق کے کتنا ہی قریب ہو ۔

رہی یہ بات کہ ترجمے کی ضرورت کیا ہے ؟ اگرچہ اسے دہرانے کی ضرورت تو نہیں ، لیکن یہ بتانا ضروری ہے کہ سابق دور میں ترقی یافتہ اقوام کا علم و ادب ترقی پذیر اقوام تک پہنچانے کے لیے ترجمے کی ضرورت در پیش ہوتی تھی ۔ لیکن جدید دور میں جب کہ اکثر اقوام علمی ترقی کی دوڑ میں حصہ لے رہی ہیں ۔ ان کے کاموں کو باہمی طور پر ترجمہ کرنے کی ضرورت ہمیشہ درپیش رہتی ہے ۔ اس کی وجہ صاف ظاہر ہے کہ لسانی رنگا رنگی ہے ۔ دنیا کے کسی بھی ملک کے لیے یہ ممکن نہیں کہ وہ دیگر اقوام کی زبان کو اپنی علمی ترقی کا ذریعہ بنائے ۔ جہاں جہاں ایسا کیا گیا ہے وہاں چند افراد تو یقیناً علمی ترقی پا سکے لیکن قوم مجموعی طور پر پیچھے ہی رہی ۔ چنانچہ بصیرت رکھنے والی اقوام نے علمی ادبی کارناموں کو اپنی ہی قومی زبان میں انجام دینے کا فیصلہ کیا اور بہت جلد اقوام عالم میں اپنا مقام بلند کر لیا ۔ جاپان اور چین کی مثالیں سامنے ہیں ۔ فرانس ، اٹلی اور جرمنی بھی اپنی ہی زبانوں میں علمی ادبی کارنامے انجام دے رہے ہیں ۔ صرف یہی نہیں بلکہ امریکہ اور برطانیہ تک دوسری زبانوں میں ہونے والے کاموں

۲۔ مولوی عبدالحق مقدمات ۔ حصہ اول ، ص ۵۳ تا ۵۳

کو اپنی اپنی زبانوں میں ترجمہ کر لیتے ہیں ۔ اس مقصد کے لیے انہوں نے دارالترجم بنا رکھے ہیں ۔ ترجمے کی ضرورت کے بارے میں مولوی عبدالحق لکھتے ہیں :

''دنیا میں ہر قوم کی زندگی میں ایسا زمانہ آتا ہے جب کہ اس کے قوائے ذہنی میں انحطاط کے آثار نمودار ہونے لگتے ہیں ۔ ایجاد و اختراع اور غور و فکر کا مادہ تقریباً مفقود ہو جاتا ہے ۔ تخیل کی پرواز اور نظر کی جولانی تنگ اور محدود ہو جاتی ہے ۔ علم کا دارو مدار چند رسمی باتوں اور تقلید پر رہ جاتا ہے ۔ اس وقت قوم یا تو بے کار اور مردہ ہو جاتی ہے ۔ یا سنبھلنے کے لیے لازم ہو جاتا ہے کہ وہ دوسری ترقی یافتہ اقوام کا اثر قبول کرے ۔''(۴)

آگے چل کر لکھتے ہیں :

''جس طرح یونان کا اثر رومہ اور دیگر اقوام یورپ پر پڑا ، جس طرح عرب نے عجم کو اور عجم نے عرب کو اپنا فیض پہنچایا ، جس طرح اسلام نے یورپ کی تاریکی اور جہالت کو مٹا کر علم کی روشنی پہنچائی ، اسی طرح آج ہم بھی بہت سی باتوں میں مغرب کے محتاج ہیں ۔ یہ قانون عالم ہے جو یوں ہی جاری رہا اور جاری رہے گا ۔

''دیے سے دیا جلتا رہا ہے ۔''

جب کسی قوم کی نوبت یہاں تک پہنچ جاتی ہے اور وہ آگے قدم بڑھانے کی سعی کرتی ہے تو ادبیات کے میدان میں پہلی منزل ترجمہ ہوتی ہے ۔ اس وقت قوم کی بڑی خدمت یہی ہے کہ ترجمے کے ذریعے سے دنیا کی اعلیٰ درجہ کی تصانیف اپنی زبان میں لائی جائیں ۔ یہی ترجمے خیالات میں تغیر اور معلومات میں اضافہ کریں گے ۔ جمود کو توڑیں گے اور قوم میں ایک نئی حرکت پیدا کریں گے اور پھر یہی ترجمے تصنیف و تالیف

۴۔ مولوی عبدالحق ، مقدمات حصہ دوم ص ۲۰۱ ۔

کے جدید اسلوب اور ڈھنگ سمجھائیں گے ایسے وقت میں ترجمہ تصنیف و تالیف سے زیادہ قابل قدر زیادہ مفید اور زیادہ فیض رساں ہوتا ہے ۔(۴)

ترجمہ کے سلسلے میں مزید فرماتے ہیں :

''یہ کام ہندوستان کے مختلف مقامات میں تھوڑا تھوڑا انجام پایا مثلاً فورٹ ولیم کالج کلکتہ میں زیر نگرانی ڈاکٹر گلکرسٹ ، دہلی سوسائٹی میں ، انجمن پنجاب میں زیر نگرانی ڈاکٹر لائٹنز و کرنل ہالرائڈ ، علی گڑھ سائنٹیفک انسٹی ٹیوٹ میں جس کی بنا سر سید احمد خاں مرحوم نے ڈالی ۔ مگر یہ کوششیں سب وقتی اور عارضی تھیں ۔''(۵)

۱۹۱۶ء میں حیدر آباد دکن میں دارالترجمہ قائم ہوا ۔ اس بارے میں مولوی صاحب یوں رقم طراز ہیں :

''احیائے علوم کے لیے جو کام آگسٹس نے روم میں خلافت عباسیہ میں ہارون الرشید اور مامون الرشید نے ، ہسپانیہ میں عبدالرحمٰن ثالث نے بکرماجیت و اکبر نے ہندوستان میں ، الفرڈ نے انگلستان میں ، پیٹر اعظم و کیتھرائن نے روس میں اور مت شی ہٹو نے جاپان میں کیا وہی فرمانروائے دولت آصفیہ نے اس ملک کے لیے کیا ۔''(۶)

پاکستان میں ترجمہ کس لیے ؟

پاکستان میں ترجمہ کی ضرورت بنیادی اہمیت رکھتی ہے ۔ یہاں انگریزی سرکاری اور تعلیمی زبان رہی ۔ آزادی کے بعد قوم کو اپنی زبان ہی کا سہارا لے کر ترقی کی منازل طے کرنا تھیں ۔ اس لیے ضرورت مخصوص

۴۔ مولوی عبدالحق ، مقدمات حصہ دوم ص ۲۰۲ ۔
۵۔ ایضاً ص ۲۰۲
۶۔ ایضاً ص ۲۵۲

کی گئی کہ سرکاری تعلیمی ، علمی اور ادبی امور کے لیے دنیا بھر کی زبانوں سے بشمول انگریزی، اردو میں ترجمہ کیا جائے ۔ تا کہ ایک تو اردو کے علمی ادبی سرمایہ میں اضافہ ہو سکے ۔ دوسرے دفتری عدالتی ، قانونی اور سرکاری امور کو جلد از جلد اردو میں انجام دیا جا سکے ۔ قومی تشخص کی پہچان کے لیے ضروری ہے کہ جتنی جلد ممکن ہو دیگر غیر ملکی زبانوں سے پیچھا چھڑایا جائے اور اپنی قومی زبان کا سرمایہ وسیع کیا جائے ۔

ترجمہ کے اس کام کے لیے جہاں نجی طور پر بہت کام کیا گیا ، وہاں سرکاری اور نیم سرکاری ادارے بھی وجود میں آئے ۔ ان میں سے چند ایک کا تذکرہ ضروری ہو گا :

۱۔ انجمن ترقی اردو پاکستان (کراچی)

یہ ادارہ قیام پاکستان سے بہت پہلے قائم ہوا ۔ اور اب تک کام کر رہا ہے پہلے صرف تحقیقی و تحریکی دونوں کام کرتا تھا ۔ اب صرف تصنیفی ، اشاعتی کام میں مصروف ہے ۔

۲۔ سائنٹیفک سوسائٹی آف پاکستان کراچی :

یہ سوسائٹی ۱۹۵۵ء میں قائم ہوئی اس کے قیام کا مقصد سر سید احمد خان کی اولین کاوش سائنٹیفک سوسائٹی کی یاد تازہ کرنا نیز سائنس کے علوم کو عام فہم ، قومی زبان میں ہر خاص و عام تک پہنچانا اور سائنسی تحقیقات کو فروغ دینا اور انہیں شائع کرنا ہے ۔

۳۔ زرعی یونیورسٹی فیصل آباد :

یونیورسٹی کے زیر اہتمام اردو زبان میں سائنسی علوم کی ایسی کتابوں کی اشاعت جو درمیانے درجے کی زرعی تعلیم پانے والے طلبہ ، زرعی کارکنوں اور عام زمینداروں کے لیے مفید ثابت ہو سکیں ۔

۴۔ ترقی اردو بورڈ ۔ کراچی :

یہ بورڈ اردو لغت کی تدوین کی غرض سے قائم کیا گیا ہے ۔

۵۔ مجلس ترقی ادب ، لاہور ۔

۱۹۵۰ء میں حکومت پنجاب کے محکمہ تعلیم نے اردو کی بقا اور اس کے ارتقاء کے لیے یہ ادارہ قائم کیا ۔ اس ادارے نے مشرق و مغرب

کی بلند پایہ علمی کتابوں کے اردو ترجمے کرائے اور انہیں شائع کیا ۔

۶۔ مرکزی اردو بورڈ لاہور :

قومی قدروں کو فروغ دینے اور اردو زبان کو درس و تدریس کا ذریعہ بنانے کے لیے مئی ۱۹۶۲ء میں مرکزی اردو بورڈ معرض وجود میں آیا ۔

۷۔ مجلس زبان دفتری پنجاب :

پنجاب کے تمام محکموں اور عدالتوں میں انگریزی کے بجائے اردو کو سرکاری زبان کے طور پر رائج کرنے کے لیے دسمبر ۱۹۴۹ء میں آفیشل لینگویج کمیٹی'' موسوم بہ ''مجلس زبان دفتری قائم کی گئی ۔

۸۔ آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس :

یہ قدیم انجمن (قائم شدہ ۱۸۶۶ء) اردو کے فروغ کے لیے پاکستان میں بھی سرگرم عمل ہے ۔

۹۔ مغربی پاکستان اردو اکیڈیمی :

یہ اکیڈیمی اردو کو اعلیٰ علمی مضامین کے اظہار اور اردو کو ذریعۂ تعلیم بنانے کے لیے ۱۹۴۸ء میں قائم کی گئی ۔

۱۰۔ ادارہ تالیف و ترجمہ پنجاب یونیورسٹی ۔ لاہور :

ستمبر ۱۹۶۲ء میں ادارہ تالیف و ترجمہ نے اپنا کام شروع کیا ۔

۱۱۔ شعبہ تصنیف و تالیف و ترجمہ کراچی یونیورسٹی :

یہ شعبہ علوم و فنون کی اعلیٰ سطح پر قومی زبان اردو میں تحقیق و تدوین کا اہتمام کرنے کے کسی پاکستانی یونیورسٹی میں قائم ہونے والا پہلا ادارہ ہے ۔

۱۲۔ مقتدرہ قومی زبان (کراچی) :

یہ ادارہ وفاق حکومت پاکستان نے ملک میں مختلف علمی و ادبی اداروں کے کاموں کو مربوط کرنے اور اردو کو انگریزی کے بجائے سرکاری زبان کے طور پر رائج کرنے کی غرض سے قائم کیا ۔ اس کی نویں مجلس ، مجلس ترجمہ ہے جو ڈاکٹر محمد اسلم فرخی کی نگرانی میں کام کر رہی ہے ۔ اس کے ذمہ یہ کام ہے کہ نہ صرف ضروری

rekhta

کتابوں/رسالوں کی نشاندہی کرے بلکہ کل پاکستان مترجمین کی فہرست بھی تیار کرنا ہے ۔ اس کی دسویں ذیلی مجلس اصطلاحات سے متعلق ہے جو ڈاکٹر رضی الدین صدیقی کی زیر نگرانی اصطلاحات کے ترجمے اور توسیع کا کام کر رہی ہے ۔

ترجمہ کتنی اقسام کا ہوتا ہے ؟

سطور بالا میں لفظی ترجمے اور مفہوم کے ترجمے کا ذکر آ چکا ہے ۔ جہاں تک ترجمے کی مختلف اقسام کا تعلق ہے ان میں حسب ذیل بنیادی حیثیت رکھتے ہیں :

۱- علمی ترجمہ ،
۲- ادبی ترجمہ ،
۳- صحافتی ترجمہ ،

ان میں سے ہر ایک ترجمہ دو طرح سے انجام دیا جا سکتا ہے ۔ یہ یا تو لفظی ترجمہ ہو گا یا مفہوم کا ترجمہ ۔

۱ ۔ علمی ترجمہ

علمی ترجمے کی ذیل میں تمام سائنسی علوم و فنون کی کتابیں آتی ہیں جن میں جغرافیہ ، تاریخ ، ریاضیات ، معاشیات ، قانون ، طبیعیات ، انجینیئری ، میکانیات وغیرہ بھی شامل ہیں ۔ علمی ترجمہ عام طور پر لفظی ترجمے کی ذیل میں آتا ہے ۔ کیونکہ ضروری ہوتا ہے کہ کسی لفظ یا اصطلاح کا جو ترجمہ ایک جگہ کیا جائے وہ ان معنوں میں ہر جگہ استعمال کیا جائے تاکہ ترجمے میں یکسانیت برقرار رہے اور قاری کا ذہن کہیں بھی الجھنے نہ پائے ۔ ان ترجموں میں سب سے اہم مسئلہ علمی اصطلاحات کے ترجموں کا ہوتا ہے ۔ علمی اصطلاحات وضع کرتے وقت اس امر کا خاص خیال رکھا جائے کہ اصطلاحیں مسلمہ اصولوں کے مطابق وضع کی جائیں ۔ یونانی ، لاطینی اور دوسرے سابقوں اور لاحقوں کے ترجمے مترادفات میں یکسانیت کو ملحوظ رکھا جائے ۔ مختلف اداروں نے ترجمہ اصطلاحات کے لیے اصول وضع کر رکھے ہیں ۔ مولوی وحید الدین سلیم نے

ایک کتاب ''وضع اصطلاحات'' اسی موضوع پر لکھی ہے ۔ جہاں تک علمی اور فنی تراجم کا تعلق ہے ، ضروری ہے کہ متعلقہ علم و فن کا ماہر ہی انجام دے ۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہر علم و فن میں اصطلاح کا اپنا مفہوم ہوتا ہے جو دوسرے علوم میں نہیں ہوتا ۔ مثلاً ثقافت کا لفظ فنون میں کوئی اور معنی دیتا ہے اور عمرانیات میں اس کا کچھ اور مفہوم متعین ہے ، جب کہ لغت میں اس کے کئی معانی دیے گئے ہیں ۔

۲ ۔ ادبی ترجمہ

ادبی ترجمے کے لیے ضروری ہے کہ یہ با محاورہ کیا جائے اور اپنی زبان کے روز مرہ ، ضرب الامثال ، تشبیہات استعارات و کنایات اور رموز و علامات سے کام لیا جائے تاکہ ترجمے میں ادبی رنگ آ جائے اور تحریر طبعزاد نظر آئے ۔ اس سلسلے میں ہاشمی فرید آبادی کی رائے قابل ذکر ہے :

> ''انگریزی سے سلیس اردو میں ترجمہ کرنے کا ایک یہ گر مترجم کو سیکھنا لازم ہے کہ جو جس اور جن سے فقرے کو پیچیدہ نہ بنائے ۔ ان کی انگریزی میں بڑی کثرت ہوتی ہے ۔ ہماری زبان میں ربط و ضبط کی دوسری تدبیریں کام میں لائی جاتی ہیں ۔ بیان کے متین و شگفتہ اور متعدد پیرائے اردو میں موجود ہیں ۔ سوائے فنی اصطلاحات کے بلیغ اور پر معنی الفاظ کا ذخیرہ بھی کچھ کم نہیں ہے ۔ البتہ انہیں برتنے کے لیے مترجم کی علمی استعداد بلند اور اپنے معیاری ادب سے اسے خوب واقفیت ہونی چاہیے ۔''(۷)

ادبی ترجمے کے لیے ادبیت کا حامل ہونا ضروری ہے ۔ اس سلسلے میں مزید بحث آگے آئے گی ۔ مختصراً یہ کہ مصنف کی بات کو اس طرح بیان کیا جائے کہ اس کی اصل حیثیت مسخ بھی نہ ہو اور ترجمہ با محاورہ اسلوب کے ساتھ ہو جائے ۔

۳ ۔ صحافتی ترجمہ

اسے کھلا ترجمہ بھی کہتے ہیں اور یہ مفہوم کے ترجمے کی ذیل میں

۷- مسکین حجازی ، فن ادارت ص ۲۹۶ ۔

آتا ہے۔ "مفہوم کا ترجمہ کرنا سب سے زیادہ آسان ہے۔ ایسے ترجموں میں کسی پابندی کی ضرورت نہیں ہوتی بلکہ مترجم کے لیے یہ آسانی ہوتی ہے کہ اصل مفہوم کو سمجھ کر اپنی زبان میں اپنے طور پر بیان کر دے، جس فن کا ترجمہ کرنا مقصود ہو، اگر وہ طویل اور پیچیدہ جملوں پر مشتمل ہو تو لازمی نہیں کہ اس کا ترجمہ بھی اسی طرح طویل اور پیچیدہ جملوں میں کیا جائے۔ بہتر ہے کہ اصل مفہوم کو چھوٹے چھوٹے سادہ جملوں میں ادا کیا جائے۔"(۸)

عبدالمجید سالک کے نزدیک "اخباری ترجمے میں سب سے مقدم مصلحت یہ ہے کہ مطلب بالکل واضح اور عبارت قطعی طور پر سلیس ہو جائے تاکہ تمام پڑھنے والوں کو کوئی الجھن نہ ہو۔ اس کے لیے اپنی زبان کا محاورہ سب سے بہتر رہنما اور معاون ہے۔ اگر اخباری مترجم سادگی، سلاست اور محاورہ اردو کو مدنظر رکھ کر ترجمہ کریں تو خود بھی آرام سے رہیں اور پڑھنے والوں کے ذہن بھی نہ الجھیں۔ ان کو چاہیے کہ جہاں انگریزی کے فقرے کی ترکیب پیچیدہ اور طویل پائیں وہاں اس کی چیر پھاڑ کر دیں اور ترجمہ کرنے کے بعد ایک دفعہ پڑھ کر دیکھ لیں کہ آیا اصل مطلب ادا ہو گیا ہے۔ اگر ہر پہلو سے مطلب ادا ہو گیا ہو تو سبحان اللہ ورنہ ادھر اُدھر کمی بیشی کر کے اسے پورا کر دیں۔ ڈکشنری مترجم کا سب سے بڑا ہتھیار ہے اور اس سے ہر ممکن مدد لینی چاہیے اور کبھی اس غلط فہمی میں نہ رہنا چاہیے کہ ہم بڑے انگریزی دان اور بڑے اردو خوان ہیں کیونکہ ممکن ہے وقت پر کسی لفظ کا صحیح اور موزوں ترجمہ نہ سوجھے اور ڈکشنری دیکھنے سے ایسا نفیس لفظ ہاتھ آ جائے جو فقرے میں جان ڈال دے۔"(۹)

ترجمہ کون کرے؟

ترجمہ کرنا ہرکس و ناکس کی بات نہیں۔ یہ ایک تخصیصی کام ہے۔ اچھے مترجم کی خصوصیات میں بہت سے امور شامل ہیں۔ مثلاً فن پاروں

۸۔ مسکین حجازی، فن ادارت ص ۲۹۶۔

۹۔ ایضاً ص ۲۹۳۔

اور ادبی تخلیقوں، صاحب طرز ادیبوں اور مصنفوں کی کتب کا مطالعہ، زبان کی گرامر، الفاظ، روزمرہ استعارات و کنایات، تشبیہات، ضرب الامثال اور ان زبانوں سے واقفیت جن سے اردو کی تشکیل عمل میں آئی ہے۔ اس میں زبان کا مزاج، رنگ ڈھنگ اور اسلوب پیرایہ بیان بھی شامل ہے

اختصار کے ساتھ تو یہ بات یوں کہی جا سکتی ہے کہ مترجم کے لیے تین باتیں ضروری ہیں:

۱۔ وہ اُس زبان پر جس سے ترجمہ کرتا ہے اور اس زبان پر جس میں ترجمہ کیا جاتا ہے، کامل عبور اور قدرت رکھتا ہو۔

۲۔ مضمون سے اگر پوری نہیں تو کم از کم اس کے مبادیات سے واقفیت ہو۔

۳۔ اس کا طرز تحریر اور پیرایہ بیان ایسا ہو کہ بات جو اصل مضمون میں بیان کی گئی ہے، اسے اچھی طرح سمجھ کر اس کے مفہوم کو صحیح طور پر اس طرح اپنی زبان میں منتقل کر سکے کہ قاری ترجمہ شدہ مواد کا مطالعہ کرتے وقت کسی ابہام کا شکار نہ ہونے پائے اور جو بات اصل مضمون میں بیان کی گئی ہے اس تک قاری کے ذہن کی رسائی ہو جائے۔ یعنی خود صاحب اسلوب ادیب ہو۔

کہا تو یہ بھی جاتا ہے اور یہ بڑی حد تک درست بھی ہے کہ کسی زبان کے مواد کو بعینہ دوسری زبان میں منتقل کرنا ممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے۔ کیونکہ ہر زبان کا اپنا آہنگ اور مزاج ہوتا ہے اور یہ صرف اسی وقت ممکن ہے جب مترجم بھی بڑی حد تک اصل مصنف کے اوصاف کا حامل ہو، وہ نہ صرف ہر دو زبانوں کی لغات پر قدرت بلکہ ان کے مزاج، تراکیب اور اسلوب سے بھی گہری واقفیت رکھتا ہو اور ترجمہ کرتے وقت اصل عبارت کو خوب اچھی طرح سمجھ کر اس کے مفہوم کو اپنی زبان میں اس کے مزاج اور آہنگ کے مطابق اس طرح سمو کر ایسے پیرایہ بیان میں منتقل کر دے کہ زبان کی سلاست و روانی اور موضوع و مفہوم کے بیان میں کہیں بھی ابہام کا شبہ تک نہ ہو سکے بلکہ قاری جس نے اصل کتاب نہ پڑھی ہو اسے اس کے اصل ہونے میں کچھ شک و شبہ نہ

ہو اور جنہوں نے کتاب کا مطالعہ کیا ہو وہ بھی ترجمے کو پڑھتے وقت کسی مقام پر الکیں نہیں بلکہ مترجم کے ساتھ ساتھ آگے بڑھتے چلے جائیں۔

مترجم کا مطالعہ جتنا وسیع ہو گا اس کے کام میں اتنی ہی عمدگی پیدا ہو جائے گی۔ لہذا اسے چاہیے کہ فنون لطیفۂ ادب، فلسفہ، تفسیات، سائنس، مذہب، اقتصادیات، سیاسیات، غرضیکہ ہر طرح کے مضامین اور زندگی کے ہر شعبے کے بارے میں واقفیت رکھتا ہو۔ یہ بات خاص کر اخباری مترجم کے لیے نہایت ضروری ہے۔ اچھا مترجم اپنے انداز بیان، لب و لہجہ، ذاتی عقل و شعور اور فہم و ادراک سے ایک کم مایہ تصنیف کو بھی بام عروج پر پہنچا دیتا ہے۔

اچھے ترجموں کے لیے موزوں الفاظ کا استعمال ضروری ہوتا ہے۔ مترادفات سے کام تو لیا جا سکتا ہے لیکن ان میں سے صرف ایک لفظ ہی موزوں ترین ہو سکتا ہے۔ لہذا اچھا مترجم وہی ہے جو موقع کی مناسبت سے موزوں ترین لفظ کا انتخاب کرے۔ ایسا صرف اس وقت ممکن ہے جب مختلف لغات مترجم کے زیر مطالعہ رہیں تاکہ وہ حسب ضرورت اپنے مطلب کا لفظ چن سکے۔ علمی اصطلاح کا ترجمہ اصطلاح میں کرے۔ اس سلسلے میں مختلف لغات میں جو ترجمے دیے گئے ہوں، ان میں سے موزوں اصطلاح کا انتخاب کرے۔ اگر اصطلاح نئی ہو تو مسلمہ اصولوں کے مطابق نئی اصطلاح وضع کر سکے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ اسے لغات پر عبور حاصل ہو، جو وسیع مطالعہ کے بغیر ممکن نہیں۔ اسے نہ صرف ان لغات کو دیکھنا پڑے گا جن میں الفاظ کے معنی بیان کیے گئے ہیں بلکہ ان لغات پر بھی نظر ڈالنا ہو گی جن میں اصطلاحوں کے ترجمے اصطلاحوں کی صورت میں دیے گئے ہیں کیونکہ "کوئی شخص بھی ہمہ دان نہیں ہو سکتا۔ مترجم خواہ کتنا ہی قابل ہو اور اس کا ذخیرہ لغت خواہ کتنا ہی وسیع ہو، ترجمے کے وقت بعض اوقات اسے ضرور لغت دیکھنے کی ضرورت محسوس ہو گی۔ لغت دیکھنے میں تساہل برتنا یا اسے کسر شان سمجھنا غلطی ہے۔ نہ صرف لغت دیکھنی چاہیے بلکہ اظہار کو بہتر سے بہتر بنانے کے لیے زیادہ موزوں الفاظ تلاش کرنے چاہییں اور لغت سے خوب کام لینا چاہیے۔"(۱۰)

۱۰۔ مسکین حجازی، فن ادارت ص ۲۹۵

مترجم کو چاہیے کہ وہ موزوں الفاظ اور اصطلاحات کو ایسے پیرائے میں بیان کرے کہ مطلب صاف اور واضح طور پر قاری کے ذہن پر نقش ہو جائے۔ اگر جملے طویل ہوں تو انہیں توڑ کر الگ الگ بیان کرے۔ یہ ضروری نہیں ہے۔ کہ ترجمہ کرتے وقت بھی اصل متن کے جملوں کی ساخت اور تراکیب کی پیروی کی جائے۔ ترجمے کی اصل غایت ابلاغ ہے۔ اس کے لیے وہ جو طریقہ بھی مناسب خیال کرتا ہے اسے اپنانے میں آزاد ہے۔

مترجم کو چاہیے کہ وہ متعلقہ مضمون کا ترجمہ کرنے سے پہلے اس فن یا علم کے بارے میں ضروری کتب کا مطالعہ کرے تاکہ ہر بات کا مفہوم واضح اور صاف طور پر بیان کیا جا سکے۔ اگر کسی بات کے بارے میں مترجم کا ذہن صاف ہو گا وہ اسے نہایت خوبی سے قاری تک پہنچا سکے گا ورنہ مفہوم میں ابہام اور بیان میں الجھاؤ کا پیدا ہونا قدرتی امر ہے۔

اردو مترجم کے لیے ضروری ہے کہ وہ اردو زبان کی ہیئت ترکیبی کا علم رکھتا ہو۔ اس کو مندرجہ ذیل چار بنیادی امور کا علم ہو۔

۱۔ اردو کی اصل

جیسا کہ نام سے ظاہر ہے کہ اردو لشکری زبان ہے اور اس کا خمیر بہت سی زبانوں سے مل کر اٹھا ہے۔ اس کی اصل ہندی ہے۔ بقول مولوی عبدالحق:

> "اردو ہندی نژاد ہے اور قدیم ہندی یا پراکرت کی آخری اور سب سے شائستہ صورت ہے۔ برج بھاشا اور فارسی کے میل سے بنی ہے۔ اس میں جو سنسکرت اور پراکرت کے الفاظ ہیں، وہ زمانۂ دراز کے استعمال اور زبانوں پر چڑھ جانے سے ایسے ڈھل گئے ہیں کہ اصل الفاظ میں جو بھدا پن اور کرختگی اور تلفظ اور لہجے کی دقت تھی، بالکل جاتی رہی اور چھٹ چھٹا کر پاک صاف سیدھے سادے رہ گئے ہیں جس سے زبان میں لوچ، گھلاوٹ اور صفائی پیدا ہو گئی اور اردو کے ہندی عناصر ہونے

میں کچھ شبہ نہیں کیونکہ بیرونی زبانوں کا اثر صرف اسماء و صفات میں ہوا ہے ورنہ زبان کی بنیاد ہندی پر ہے۔ مقام حروف فاعلی، مفعولی، اضافت، نسبت، ربط وغیرہ ہندی ہیں۔ ضمیریں سب کی سب ہندی ہیں۔ لیکن عربی فارسی الفاظ کے اضافے نے مختلف صورتوں میں اس کی اصل خوبی میں اضافہ کر دیا ہے۔ ہندی الفاظ میں دلنشینی کا خاص اثر ہے اور عربی فارسی الفاظ نے نہ صرف لغت میں بلکہ خیالات میں وسعت پیدا کر دی ہے جس سے اس کا حسن دوبالا ہو گیا اور وہ زیادہ وسیع اور کار آمد بن گئی(۱۱) "فارسی کی آمیزش نے اس زبان میں وہ آبداریاں پیدا کی ہیں جن کے بغیر اس تیغ ہندی کے سارے جوہر کبھی نہ کھلتے"۔(۱۲)

"مگر اصل بنیاد جس پر وہ قائم ہے ہندی ہے۔ محض غیر زبانوں کے اسماء و صفات کے اضافہ سے اس کے ہندی ہونے میں مطلق فرق نہیں آ سکتا۔ مثلاً آج کل بہت سے انگریزی لفظ داخل ہوتے جاتے ہیں لیکن اس سے زبان کی اصلیت و ماہیت پر کچھ اثر نہیں پڑ سکتا۔ ایک دوسری بات اردو زبان میں یہ ہے کہ وہ اس اصول پر قائم ہے جو تمام جدید زبانوں میں اس وقت پایا جاتا ہے یعنی صورت ترکیبی سے حالت تفصیلی کی طرف اس کا رجحان ہے۔"(۱۳)

ایک اور جگہ لکھتے ہیں :

"سید انشا پہلے شخص ہیں جنھوں نے عربی فارسی کا متبع چھوڑ کر اُردو زبان کی ہیئت و اصلیت پر غور کیا اور اس کے قواعد وضع کیے۔"

وہ اس بارے میں یوں فرماتے ہیں :

۱۱۔ مولوی عبدالحق، مقدمات ص ۱۲۱

۱۲۔ مولوی احمد دین، سرگزشت الفاظ ص ۵

۱۳۔ مولوی عبدالحق مقدمات حصہ دوم ص ۱۲۱

"ہر لفظ جو اردو میں مشہور ہو گیا، عربی ہو یا فارسی، ترکی ہو یا سریانی، پنجابی ہو یا پوربی ازروئے اصل غلط ہو یا صحیح وہ لفظ اردو کا ہے۔ اگر اصل کے موافق مستعمل ہے تو بھی صحیح ہے اور اگر خلاف اصل مستعمل ہے تو بھی صحیح ہے۔ اس کی صحت و غلطی اردو کے استعمال پر موقوف ہے۔ کیونکہ جو کچھ خلاف اردو ہے گو اصل میں وہ صحیح ہو غلط ہے اور جو کچھ موافق اردو ہے، صحیح ہے گو اصل میں صحت نہ رکھتا ہو۔ اس اصول کو قائم کرنے کے بعد بہت سے عربی الفاظ کو جو اردو میں کچھ سے کچھ ہوگئے ہیں۔ صحیح بتاتے ہیں مثلاً سید انشا کی رائے میں برفا صحیح اردو لفظ ہے گو وہ خلاف اصل ہے یا وہ غدر کو بفتح "د" اردو کا صحیح لفظ خیال کرتے ہیں اگرچہ اصل میں بسکون دال ہے"(۱۴)

۲۔ الفاظ و معانی

ہر فن کے کچھ تقاضے ہوتے ہیں۔ کچھ شرائط و قیود ہوتی ہیں اور کچھ پابندیوں کو قبول کرنا پڑتا ہے۔ فن کار اپنے فن پارے کی تخلیق اپنے خون جگر سے کرتا ہے۔ موزوں الفاظ کے انتخاب میں کاوش کرتا ہے صحیح لفظ کی تلاش کے لیے تگ و دو کرتا ہے اور پھر اُسے اس طرح ترتیب دیتا ہے کہ جب وہ موزونیت، ہیئت اسلوب اور پیرایہ بیان کے قالب میں ڈھل کر نکلتا ہے تو اپنے اندر اک ندرت لیے ہوئے ہوتا ہے۔

ہر لفظ اپنے اندر ایک کائنات سمیٹے ہوئے ہے۔ ایک تاریخ رکھتا ہے، اخلاق، سماجی، معاشی، علمی، سائنسی اور فنی حیثیت کا حامل ہوتا ہے اور اپنے مخصوص معنی سے قاری کے ذہن کے دریچے اس طرح کھول دیتا ہے کہ وہ ایک لفظ سے اس کے بارے میں مکمل آگاہی حاصل کر لیتا

۱۴۔ مولوی عبدالحق مقدمہ دریائے لطافت ص ۱۷۲

rekhta

ہے ۔ مثال کے طور پر جب ہم اخلاق ، مذہب یا سائنس کا لفظ سنتے ہیں تو ہمارے سامنے غور و فکر کی ایک وسیع دنیا آباد ہو جاتی ہے ۔

الفاظ اور معانی کا رشتہ بہت گہرا ہے ۔ ہر لفظ کسی خاص مفہوم کو ادا کرنے کے لیے مخصوص لفظ ہوتا ہے ۔ اور اس سے صرف وہی مفہوم مراد لیا جا سکتا ہے کوئی اور نہیں ۔ سید عابد علی عابد لکھتے ہیں :

> ”علم معانی ابلاغ و اظہار کے موزوں ترین وسائل سے بحث کرتا ہے ۔ مترادف الفاظ کے اختلاف دکھاتا ہے ۔ الفاظ کی تقدیم و تاخیر سے جملے کی وہ مخصوص ترتیب پیدا کرنا چاہتا ہے جو ابلاغ کامل اور اظہار تام کو لازم ہے ۔ معانی کے اظہار کے لیے مناسب ترین الفاظ ، کلمات اور مرکبات کا جویا ہے ۔“(۱۵)

۳ ۔ مترادفات و مرادفات

مترادفات کے ضمن میں سید عابد علی عابد لکھتے ہیں ۔

”لغت کا ذخیرہ الفاظ بہت محدود ہے اور ذہن انسانی کی پرواز بے کراں ۔ اس لیے لغت تو یہ کر سکتی ہے کہ ایک کلمے کے کئی سلسلہ معانی متعین کر دے ، لیکن یہ نہیں کر سکتی کہ ایک ہی معانی کے لیے دو لفظ مہیا کر دے جہاں ایسا اشتباہ ہوگا وہاں الفاظ مترادف ہوں گے مرادف نہیں ۔ مراد یہ ہے کہ معانی میں قریب تر تو ہوں گے لیکن کوئی دلالت ضرور مختلف ہو گی ۔(۱۶)

۴ ۔ اصطلاح کی ضرورت

اصطلاح کی ضرورت سے ہم سب آگاہ ہیں ۔ بقول مولوی وحید الدین سلیم : ”اگر اصطلاحیں نہ ہوں تو ہم علمی مطلب کے ادا کرنے میں طول لا طائل سے کسی طرح نہیں بچ سکتے ۔ جہاں ایک چھوٹے سے لفظ سے کام نکل سکتا ہے ۔ وہاں بڑے بڑے لمبے جملے لکھنے پڑتے ہیں اور ان

۱۵۔ سید عابد علی عابد ، اصول انتقاد ادبیات ص ۱۹۱
۱۶۔ ایضاً اسلوب ، ص ۱۹۶

کو بار بار دہرانا پڑتا ہے ۔ کہنے والے کا وقت جدا ضائع ہوتا ہے اور پڑھنے والے کی طبیعت جدا ملول ہوتی ہے ۔ اصطلاحیں در حقیقت اشارے ہیں جو خیالات کے مجموعوں کی طرف ذہن کو فوراً منتقل کر دیتی ہیں ۔“(۱۷)

لغت اور اصطلاح کا فرق محمد حسین آزاد یوں بیان کرتے ہیں ”عرب کے اہل تحقیق نے کہا ہے کہ لغت وہ ہے جس پر جمہور کا اتفاق ہو ۔ اصطلاح وہ ہے جس پر خاص گروہ کا اتفاق ہو ۔ البتہ کوئی علمی مصنف یا صاحب ایجاد قادر الکلام شخص بھی الفاظ ایجاد کر سکتا ہے ۔ لیکن ان کے قیام عمر کے لیے اسے بھی جمہور کا حسن قبول حاصل کرنا پڑے گا ۔“(۱۸)

اصطلاحات کی بنیادی خوبی کے بارے میں سید عابد علی عابد نے بڑی اچھی وضاحت کی ہے :

> ”اصطلاحات کا تعلق علم معانی سے ہے کہ اصطلاح میں بھی دلالت ہمیشہ وضعی ہوتی ہے ۔ یہ درست ہے کہ ایک لفظ کے عام معانی اور ہوتے ہیں اور اصطلاحی معانی اور ۔ لیکن دونوں صورتوں میں دلالت کی صورت وضعی ہی قائم رہتی ہے ۔ مثال کے طور پر اردو محاورے میں فکر ، تشویش اور غور و فکر کو بھی کہتے ہیں لیکن نفسیات کی اصطلاح میں یہ عمل ذہنی ہے جس سے کام لے کر ہم مقدمات کو ترتیب دیتے ہیں اور نتائج کا استنباط کرتے ہیں ۔ اگرچہ لفظ کے معانی اصطلاح بننے پر بدل گئے لیکن لفظ جب اصطلاح بن چکے تو پھر متعلقہ علم میں ہمیشہ اسی معنی میں استعمال ہو گا اور اس کے لیے کبھی کوئی دوسرے معانی نہیں لیے جائیں گے ۔ یہی دلالت وضعی کی شناخت ہے کہ درخت کہہ کر پتھر کبھی مراد نہ لیں گے ۔“(۱۹)

ترجمہ کے بنیادی اصول

ان تمام امور کی بنا پر ترجمہ کے لیے جو اصول بنیاد بنتے ہیں کچھ یوں ہیں :

۱۷۔ مولوی وحید الدین سلیم ، وضع اصطلاحات ص ۲
۱۸۔ مولوی محمد حسین آزاد ، سخندان فارس ، ص ۱۳
۱۹۔ سید عابد علی عابد ، اصول انتقاد ادبیات ص ۱۹۰

۱۔ ہر انگریزی لفظ کے لیے ایک ہی اردو لفظ کا استعمال کیا جائے۔ بشرطیکہ خود اس انگریزی لفظ کے متعدد معنی نہ ہوں۔

مثلاً انگریزی لفظ ڈیفنس کے لیے اردو میں اگر ہم کہیں اس کا ترجمہ دفاع کریں، کہیں تحفظ اور کہیں حفاظت وغیرہ تو غلط ہو گا ہمیں چاہیے کہ ڈیفنس کے لیے ایک ہی لفظ رکھیں مثلاً دفاع۔ البتہ بعض الفاظ ایسے بھی ہو سکتے ہیں جن کے متعدد اور مختلف معنی ہوں۔ اردو میں ایسے الفاظ کے ترجمے میں ان مختلف معانی کا خیال رکھنا چاہیے مثلاً ایوارڈ کا ترجمہ عطیہ بھی ہو سکتا ہے اور فیصلہ بھی عطیہ اس وقت جب مفہوم رقمی ہو اور فیصلہ اس وقت جب مفہوم ثالثی ہو۔

اسی طرح کا ایک لفظ کیس ہے جب کہ اس کا مفہوم عدالتی ہو تو اس کا ترجمہ مقدمہ ہو گا۔ طب میں مریض، میکانیات میں خانہ اور دفتری استعمال میں مسل یا معاملہ۔

۲۔ علمی کتاب کا ترجمہ کرنے سے پہلے مترجم کو چاہیے کہ وہ پہلے پوری کتاب کا مطالعہ کرے اور اصطلاحوں کو نشان زدہ کرنے کے بعد ان کی فہرست تیار کر لے۔ ان کے لیے موزوں ترجمے تجویز کرے اور ہر جگہ وہی اصطلاح اختیار کرے۔ کتاب کے آخر میں ان اصطلاحوں کی ایک فہرست بترتیب الفبائی درج کرے۔

۳۔ کسی انگریزی لفظ کا اردو متبادل جہاں تک ممکن ہو اس قسم کا لفظ منتخب کرنا چاہیے کہ اس سے مشتقات وضع ہو سکیں مثلاً ایڈمنسٹریشن کا ترجمہ انتظام ہو سکتا ہے۔ اس سے ہم تنظیم، تنظیمی، منتظم، انتظامی اور انتظامیہ وغیرہ الفاظ مشتق کر سکتے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ ہمیں مختلف انگریزی الفاظ کے لیے مختلف اور متبادل مخصوص کرنے پڑتے ہیں مثلاً آرگنائزیشن کے لیے تنظیم اور مینجر کے لیے منتظم۔

یہ بات درست نہیں ہو گی کہ انگریزی کے لفظ کا ترجمہ کچھ ہو اور اس کے مشتقات کا کچھ اور جو اصل لفظ سے مشتق نہ کیا گیا ہو۔

مثلاً اگر ہم ڈیفنس کے لیے دفاع کا لفظ رکھیں تو "ڈیفنس ایریا" کے لیے "حفاظتی علاقہ" تو درست نہیں ہو گا۔ اس کا ترجمہ "مدفوعہ علاقہ" ہونا چاہیے۔

۴۔ انگریزی کی فنی اصطلاحات کا ترجمہ کرتے وقت یہ خیال رکھا جائے کہ اردو میں بھی وہ لفظ اصطلاح کی حیثیت رکھتا ہو نہ کہ تشریح کی۔ مولانا وحید الدین سلیم پانی پتی نے اصطلاح کی یہ تعریف کی ہے "کہ یہ ایک چھوٹی سی علامت ہوتی ہے جو بڑے مفہوم کی طرف اشارہ کرتی ہے اور بولنے والوں اور لکھنے والوں کو وقت ضائع کرنے سے بچاتی ہے۔"

کسی فنی اصطلاح کا مقصد اختصار ہے لیکن ایسا اختصار جو معنویت سے لبریز ہو۔ ایک اصطلاح کوئی مخصوص شے یا تصور ظاہر کرتی ہے۔ اس کا مفہوم مبہم نہ ہونا چاہیے۔ ہر شعبہ فن کی اصطلاحات مخصوص ہوتی ہیں۔ ان میں شک و شبہ اور ابہام نہیں ہوتا۔ اگر ہم لمبی چوڑی تشریح یا ترکیبیں استعمال کریں تو اصطلاح کا مقصد ہی فوت ہو جاتا ہے۔ مولانا وحید الدین سلیم کے الفاظ میں "اصطلاح سے اختصار مقصود ہو تا کہ ایک چھوٹے سے لفظ سے وسیع معنی مراد لیے جائیں۔ اگر ایسا نہ کیا جاتا اور ہمیشہ اس بات کی کوشش کی جاتی کہ عبارت خواہ کسی قدر طولانی ہو جائے تاہم پورا اور صحیح مفہوم ظاہر ہو تو پھر اصطلاح وضع کرنے کی ضرورت باقی نہ رہتی۔" مثلاً اگر "سیکشن پائپ" کا ترجمہ یوں کیا جائے۔ وہ نل جو ہوا، پانی یا کسی اور مائع چیز کے چوسنے کا کام کرے، تو یہ اصطلاح نہ ہوئی۔ اس کے لیے "چوسنانل" اصطلاح کے طور پر زیادہ درست ہو گا۔

۵۔ اگر اردو میں کسی انگریزی لفظ کے لیے پہلے سے کوئی لفظ موجود ہے تو نیا لفظ نہ گھڑا جائے۔ بہتر ہے کہ اسی کو استعمال کیا جائے۔ مثلاً بل آف ایکسچینج کے لیے اردو میں پہلے سے ایک لفظ "ہنڈی" موجود ہے۔ اگر ہم اس لفظ سے صرف نظر کرکے اس کا

نیا ترجمہ "تبادلہ بل" وغیرہ کریں تو درست نہ ہو گا۔

۶- بہت سے انگریزی الفاظ اردو زبان کا جزو بن چکے ہیں۔ انھیں جوں کا توں رہنے دیا جائے۔ مثلاً رجسٹری، بل، ڈاک، ٹکٹ وغیرہ۔

۷- بہت سے انگریزی الفاظ اردو میں آ کر بگڑ گئے ہیں لیکن وہ اردو میں عام طور پر استعمال ہوتے ہیں۔ انہیں بھی جوں کا توں رہنے دیا جائے۔ یہ کوشش نہ کی جائے کہ انگریزی کا صحیح لفظ ان کی جگہ بولا جائے کہ مثلاً رولد (راؤنڈ) فیس، ڈگری، کارتوس، اردلی وغیرہ۔

۸- اگر کوئی انگریزی اصطلاح اور اس کا اردو متبادل دونوں یکساں طور پر اردو میں مقبول ہیں تو پھر اس میں کوئی حرج نہیں کہ دونوں کو رہنے دیا جائے۔ مثلاً کمیٹی اور مجلس وغیرہ۔

۹- ایسے موزوں مقامی الفاظ کو بھی جگہ دی جا سکتی ہے جو خاصے مقبول ہو چکے ہوں۔ بجائے اس کے کہ کوئی مصنوعی اور بھونڈی اصطلاح وضع کی جائے مثلاً "ہاینک ایمونیشن" کو پشتو بولنے والے "شلخی" کہتے ہیں۔ "برسٹ آف فائر" کو پنجابی "چھٹا" کہتے ہیں۔ ان انگریزی الفاظ کے اگر کچھ اور ترجمے ہم کریں تو وہ نامانوس ہوں گے۔ پھر کیوں نہ مستعمل لفظ "شلخی" اور "چھٹا" رکھ لیے جائیں۔

۱۰- جہاں تک ممکن ہو ہندی اضافت اور حروف جار استعمال نہ کیے جائیں۔ مثلاً "ٹائم گلاس" کا ترجمہ "ریت گھڑی" کیا جائے بجائے اس کے کہ "ریت کی گھڑی" کیا جائے یا کنٹریکٹ ایگریمنٹ" کا "ترجمہ اقرار نامہ ٹھیکہ" "بجائے اس کے کہ اسے ٹھیکے کا اقرار نامہ کہا جائے۔

۱۱- جس موضوع کا ترجمہ کرنا مقصود ہو اس سے متعلق کتب وغیرہ کا مطالعہ کر لیا جائے۔

۱۲- مختصرات کا ترجمہ نہ کیا جائے بلکہ پورے لفظ کا ترجمہ اختیار کیا جائے۔ مثلاً گورنمنٹ کے لیے انگریزی میں مختصر طور گوبٹ اور لیفٹیننٹ کرنل کے لیے (لٹ کرنل) لکھا جاتا ہے۔ لیکن ترجمہ کرتے وقت ان کا ترجمہ مکمل صورت میں کیا جائے۔

مسائل و مشکلات

ترجمے کے بنیادی مسائل[1]

ترجمے دنیا کی اُن تمام زبانوں میں ہوتے ہیں جو لکھی اور بولی جاتی ہیں اور اُن زبانوں میں بھی ہوتے ہیں جو لکھی تو جاتی ہیں مگر بولی نہیں جاتیں (میرا مطلب اپنے یہاں راشٹر بھاشا اور امریکہ کی اسپرانٹو سے ہے) لیکن بڑے تعجب کی بات یہ ہے ۔ کہ ترجموں کے متعلق کسی نے کوئی واضح کتاب یا کوئی ایسی تصنیف یا تالیف نہیں چھوڑی جو ترجمے کے بنیادی مسائل کو ساری دشواریوں کو سامنے رکھ سکے اور ان کا حل بتا سکے ۔ اور جس سے ترجمہ کرنے والوں کو آگے چل کر اپنی ڈگر معلوم ہو سکے ۔ اُنہیں اپنی حدود اور اپنی ذمہ داریوں کا علم ہو سکے اور جسے وہ اپنی تربیت کے لیے استعمال کر سکیں ۔

زیادہ حیرت اُس وقت ہوتی ہے جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ لغت اور اصطلاحوں کی بحث پر ہر زمانے میں کافی توجہ کی گئی ہے اور لسانیات کے ایک سے ایک بہتر ماہر نے لغت اور اصطلاح سازی کو زیادہ مکمل اور زیادہ مفید بنانے کی کوشش کی ہے ۔ مگر ترجمے کے اہم سوالوں اور اصولوں کو اُنہوں نے ترجمہ کرنے والے کے ضمیر اور اسی کی صلاحیت پر چھوڑ دیا ہے اور خود اپنی کاوشوں کو نشان راہ کے طور پر چھوڑ کر چلے گئے ہیں ۔

ڈاکٹر کیمبل اور الگزنڈر ٹٹلر جنہوں نے اس مسئلے پر انیسویں صدی کے وسط میں دو اہم مضمون لکھے ہیں ۔ ان کا بیان ہے کہ لاطینی ، عبرانی ، یونانی ، فرانسیسی ، اور انگریزی جیسی وسیع اور دولت مند زبانوں میں اُنہیں اس موضوع پر کوئی کتاب یا مستقل تصنیف نظر نہیں آئی ترجمے کے مسائل پر کوئی بنیادی اصول وضع نہ کرنے کا نتیجہ یہ ہؤا ہے کہ خود انگریزی اور فرانسیسی زبانوں کے مانے ہوئے مترجم ڈرائڈن کے بیان کے مطابق بہت کم ترجمے ہیں جو قابل برداشت ہیں کیوں کہ ترجمہ

۱- مطبوعہ ادب لطیف لاہور اگست ۵۳ء ص ۹-۲۱

کرنے کے لیے جس درجے کی ذہانت ، سنجیدگی ، علم اور مشق کی ضرورت ہے وہ بہت کم لوگوں میں پائی جاتی ہے اور ترجمہ کرنے کے معاملے میں ہر شخص بے لگام ہے ۔ جس کے جو جی میں آتا ہے ترجمہ کر ڈالتا ہے ۔

ترجموں کی اہمیت

نئی زبانیں قدیم زبانوں کی اُنگلی پکڑ کر چلنا سیکھتی ہیں اور قدیم و جدید زبانیں اپنی ہم عصر زبانوں کا سہارا لیتی ہیں یہ عمل ہمیشہ سے جاری ہے اور ترجمہ ہی ایک سب سے اہم ذریعہ ہے جس کی بدولت یہ عمل آج تک جاری ہے چراغ سے چراغ جلتا ہے اور کڑی سے کڑی ملتی جاتی ہے ۔

ترجمے ہی کے ذریعے ایک مخصوص ملک ایک جغرافیائی علاقے اور ایک خاص قوم کی تحقیقات ، اس کے علوم اور اس کے فنون تمام انسانیت کی ملکیت بنتے ہیں ۔ اس لحاظ سے ترجمے کی ذمہ داری کم از کم اتنی ہی اہم ہے جتنی کسی کیمیاوی قوت کو ایک روپ سے دوسرے روپ میں ڈھالنے کی ہوتی ہے تیل کوئلے اور سونے کی کانیں جب تک زمین کے سینے میں دبی رہیں ۔ اس وقت تک وہ قومی دولت نہیں سمجھی جاتیں لیکن جب اس ذخیرے کو ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کیا جانے لگے تو یہی عمل دولت کی پیداوار سمجھا جاتا ہے ۔ اور یہ دولت تمام عالم انسانی کی مجموعی دولت میں اضافہ کرتی ہے ۔

سقراط ، دی مقراطیس اور افلاطون کی دو ہزار سال اور اس سے زیادہ پرانی کاوشیں روما اور یونان کے قدیم کھنڈروں میں دب دبا کر رہ گئی تھیں مگر عربی زبان انہیں وہاں سے نکال کر یورپ کی آخری مغربی سرحد اور ایشیا کی آخری مشرق سرحد تک کھلی ہوا میں دے گئی ہوتی ۔ ابن رشد اور ابن تیمیہ کا زمانہ غرناطہ اور قرطبہ کے محاصرے میں دم توڑ چکا ہوتا اگر فرانسیسی اور انگریزی زبانوں نے اسے اپنے یہاں منتقل کرکے تاریخ و فلسفے کے اگلے ورق کے لیے محفوظ نہ کر لیا ہوتا ترجمہ بجائے خود ایک مستقل علم ہے اور اس علم میں بھی اضافہ ہے جس کی تصنیف کا ترجمہ کیا جا

رہا ہے ۔ لیکن اسی کے ساتھ ترجمے کی خاطر اضافہ کرنا بھی پڑتا ہے زبان میں ترجمے کی خاطر نئے الفاظ و اصطلاحات ، محاوروں اور کہاوتوں کا اضافہ کرنا پڑتا ہے کہیں اصل تصنیف کے الفاظ و عبارت کو ترجمہ کرکے پیش کرنے میں یہ اضافہ خود بہ خود ہو جاتا ہے ۔ اور اس طرح ترجمے کے ذریعے سے اس زبان کی لغت اور طرز ادا میں بھی اضافے ہوتے ہیں ۔ جس میں ترجمے کیے جاتے ہیں ۔

ترجمے کے ذریعے علم انسانی میں اضافہ کرنے والوں کا قافلہ بڑا تاریخی ہے ۔ اور بہت طویل ہے اس میں بڑے بڑے راہبر ملے ہیں ۔ اگلے سرے پر بو علی سینا موجود ہیں تو پچھلے سرے پر والٹیر ۔ بو علی سینا نے یونانی سے الہدائیہ کا ترجمہ کرکے معلم ثانی کا لقب حاصل کیا اور پورے مشرق کو علم طب کی یونانی تحقیقات سے آگاہ کر دیا ۔ اور والٹیر نے شیکسپیئر کا ترجمہ کرکے فرانسیسی زبان کے ذخیرے میں بیش بہا اضافہ کیا اور خود اپنی شاعرانہ صلاحیتوں کا لوہا منوا لیا ۔

ترجمے کی اس اہمیت کو ہر زمانے میں تسلیم کیا گیا ہے۔ جاگیرداری حکومتوں کے طویل زمانے میں ہم جا بہ جا دیکھتے ہیں کہ دوسری زبانوں سے مختلف علوم و فنون کے ترجمے کرانے کے لیے بڑے پیمانے پر انتظامات کیے گیے ہیں ۔ سرکاری طور پر زیادہ سے زیادہ ترجموں کی اشاعت کا انتظام کیا گیا ہے ۔ اشوک کے پاٹلی پتر میں ، بنی عباس کے بغداد میں ، فاطمین مصر کے سکندریہ میں ، عہد اکبری کے آگرہ میں اور بالآخر نظام کے حیدر آباد میں دارالترجمے ملتے ہیں اور پھر ان مقامات سے جو ترجمے شائع ہوئے ان کا اثر خود ان زبانوں کی ساخت پر پڑا جن میں وہ ترجمے کیے گئے تھے نہایت قریبی مثال کے لیے یہ کہنا کافی ہے کہ فورٹ ولیم کالج کے ترجموں کو موجودہ ہندی ، اردو ، نثر کی تاریخ کا اولین باب کہا جاتا ہے۔ اس طرح ترجموں کے ذریعے دور دراز کی زبانوں نے ایک دوسرے سے مل کر سنگم بنائے ہیں ، چھوٹے چھوٹے دھاروں کے پاٹ چوڑے کیے ہیں اور ان میں زیادہ گہرائی اور زیادہ تیزی پیدا کی ہے ۔

اُردو تو ایک بولی سے ایک باقاعدہ زبان بنی ہے ترجموں کی بدولت کہیں یہ ترجمے کتابی صورتوں میں ہوئے اور کہیں محض خیال ، استعارے، اور اصطلاحوں کی صورت میں ۔ تاریخ دہرانے کی یہاں گنجائش نہیں ، بہر حال یہ مسلمہ ہے ۔ کہ عربی ، فارسی ، سنسکرت اور انگریزی کے علاوہ مقامی بھاشاؤں کے ترجموں کو اردو زبان کی تعمیر اور تربیت میں بڑا دخل ہے ۔

لیکن چونکہ ہماری زبان کو منظم کام کا ایک پر سکون زمانہ نہیں نصیب ہوا اور بااقتدار طبقے کی سر پرستی کی مناسب عمر اسے نہیں ملی اس لیے ترجموں میں خاص طور سے بڑی غیر ذمہ داری برتی گئی ہے اور کہیں کہیں غیر زبانوں کا دخل۔دخل بے جا بھی ہو گیا ہے۔اور ایسے ترجمے ہوئے ہیں جو زبان کو عوام سے قریب لانے کے بجائے اسے اور دور لے جاتے ہیں اور ترجموں کو نا قابل فہم بنا دیتے ہیں ۔

احتساب بڑی اہم چیز ہے خاص طور سے زبان و ادب کے معاملے میں کیوں کہ یہ وہ میدان ہے ۔ جہاں بے اعتدالی کرنے پر کوئی قانونی گرفت نہیں ہوتی۔ ادب کے لیے سو طریقے احتساب کے مقرر ہیں۔ علم معانی، علم بیان، عروض یہ سب پیمانے ہیں اور ان پیمانوں سے ناپ تاپ کر نثر و نظم کو دیکھا جاتا ہے ۔ پھر تنقید کے ذریعے احتساب ہوتا ہے اور اس کے بعد خود تنقیدی اصول ہیں ۔ جو تنقید کا بھی احتساب کرتے ہیں لیکن ترجمہ جو اگر کامیاب ہو تو بجائے خود تخلیقی ادب کا حصہ بن جاتا ہے ۔ اس کے احتساب کا کوئی اصول وضع نہیں کیا گیا اور نہ ایسے پیمانے بنا کر ترجمہ کرنے والوں کے سامنے رکھے گئے ہیں جو احتساب کے کام آ سکیں ۔

یہی وجہ ہے کہ وہ دوسری زبانوں میں بھی خاص طور سے ہماری زبان میں ایسے ترجموں کی کوئی کمی نہیں ہے جو زبان و ادب میں اضافہ کرنے کے بجائے اسے اور نقصان پہنچاتے ہیں ۔ لب و لہجہ پر بڑا اثر ڈالتے ہیں اور اصل تصنیف کی طرف رغبت پیدا کرنے کے بجائے اس سے تنفر دلاتے ہیں ۔ اور اردو کے مزاج راس نہیں آتے ۔

زبان کا مزاج

ہر زبان کا اپنا ایک مزاج ہوتا ہے یہ مزاج بنا لینا ترجموں کے معاملے میں بہت اہم چیز ہے ۔ یہاں میں اس تفصیل میں نہیں پڑوں گا کہ یہ مزاج

کیوں کر بنتا ہے لیکن مزاج کے لفظ سے غلط فہمی دور کرنے کے لیے اتنا کہنا کافی ہے کہ زبان کا مزاج تقریباً ویسی ہی حقیقت ہے ۔ جیسے کسی قبیلے یا کسی خاص قوم کا مزاج (جسے ذرا بدل کر قومی تہذیبی روایت بھی کہتے ہیں) یہ مزاج تاریخی ، جغرافیائی ، سماجی اور معاشی اغلاط سے بنتا ہے۔ اور کسی ایک غلطی کی کمی بیشی اس مزاج پر اثر انداز ہوتی ہے ۔

پھر جس طرح ایک قوم کے مشترکہ مزاج کے اندر رہتے ہوئے ہر فرد کا اپنا الگ الگ مزاج ہوتا ہے اسی طرح ہر زبان کے اندر الگ الگ زبانیں بھی ہوتی ہیں۔ مشترکہ زبان پورے ایک سماج کی ہوتی ہے ۔ اور تاریخ کے ایک دور کی ہوتی ہے ۔ لیکن اسی ایک مشترکہ قومی زبان کے اندر الگ الگ لہجے ہوتے ہیں ۔ علاقوں کے لہجے ، خطوں کی بولیاں ، طبقوں کے رہن سہن اور حالات زندگی کے مطابق ، اصطلاحیں اور محاورے ، قبیلوں اور فرقوں کی تاریخی روایات کے مطابق تلمیحیں ، تشبیہیں اور استعارے ، اور پھر ان سب کے بعد ایک مخصوص سماجی دور کی اصطلاحیں ، ان سے ایک زبان کے اندر کئی زبانیں پیدا ہوتی ہیں ۔ اور اس وقت تک قائم رہتی ہیں جب تک سماج متفرق رہتا ہے ۔

زبان کے مزاج کو اور زیادہ واضح کرنے کے لیے دو مثالیں کافی ہوں گی :۔

فارسی زبان ایک ایشیائی زبان ہے ۔ جس کا تعلق آریائی زبانوں کے خاندان سے ہے پہلوی زبان کے قدیم ترین جاگیرداری عہد کی اعلیٰ تہذیب کے بنیادی عناصر اس میں شامل ہوئے ۔ بعد میں کیانی خاندان کی زبردست ایشیائی سلطنت کے شان و شکوہ نے اس میں اپنا نفوذ کیا ۔ اور اپنی عظمت اور خوش حالی کے نشان چھوڑے ۔ مرکزی ایران کی زرخیز وادی کی آب و ہوا نے اسے لوچ بخشا ۔ عربوں کے غلبے نے اس میں عربی الفاظ و اصطلاحات کی کثرت پیدا کی ۔ تاتاری حملوں نے اور بعد میں طوائف الملوک نے اس میں سوز و گداز کی کیفیت اور انفعالی اثرات پیدا کیے ۔ قاچاری عہد نے انگریزی اور فرانسیسی تہذیب کی چمک دمک پیدا کی ۔ اور اب قومی آزادی کا عام شعور اور انقلابی تحریک اسے اپنے رخ پر ڈھال رہی ہے ۔

فارسی زبان و ادب کو پچھلے ڈھائی ہزار برس میں کئی قوموں سے سابقہ پڑا ہے اور کئی زبانوں کے اثرات اس پر حاوی ہوئے ہیں ۔ لیکن ان میں پائدار اثرات وہی ہیں ۔ اور وہی زیادہ سے زیادہ مقبول رہے ہیں ۔ جو اس زبان کے مزاج کو راس آئے اور جو اوپر سے تھوپے گئے تھے ۔ بیرونی دباؤ ہٹ جانے کے بعد وہ اثرات بھی دور ہو گئے آج عربی زبان کی ان مشکل اصطلاحوں کا گزر فارسی میں نہیں ہے ۔ جن کے لیے خود فارسی زبان کے الفاظ موجود تھے یا آسانی سے زبان پر چڑھ سکتے تھے ۔ اور ان عربی لفظوں کو زبان سے خارج نہیں کیا جا سکتا ہے ۔ جنہیں فارسی نے اپنا جزو بدن بنا لیا ہے ۔

سیاسی اعتبار سے ایران پر فرانس کے مقابلے میں برطانیہ کا زیادہ اثر ہے ۔ لیکن دو سو برس کے برطانوی اثر کے باوجود فارسی زبان کا مزاج انگریزی کو اتنا قبول نہیں کر سکا جتنا اس نے فرانسیسی زبان کو کیا ۔ جس طرح حروف تہجی اور آوازوں کی ادائیگی میں فارسی زبان اپنی بہن سنسکرت کے ٹ ، ڈ اور ڑ کو قبول نہ کر سکی ۔ اسی طرح اس نے انگریزی کی اصطلاحوں ، محاوروں اور الفاظ کے مقابلے میں فرانسیسی کو زیادہ قریب پایا اور اسی کو اپنے اندر کھپایا یہ ایک حرف ژ کا ہی نہیں بلکہ مزاجی ہم آہنگی کا نتیجہ ہے کہ جدید ترین فارسی میں ہمیں فرانسیسی کے کثیر الفاظ ملتے ہیں اور فارسی زبان و ادب کا مغربی ادب سے جو رشتہ قائم ہوا ہے وہ فرانسیسی کے ذریعے سے ہوا ہے ۔

اب جو لوگ فارسی زبان میں انگریزی ، روسی یا اُردو زبان سے ترجمہ کرنا چاہیں انہیں صرف لغت کا نہیں بلکہ فارسی زبان کی اس تاریخ کا ، اور اس کے مزاج کا بھی پورا احساس ہونا چاہیے تاکہ ان کا ترجمہ فارسی زبان و ادب کو کچھ دے سکے اور اس کا ایک حصہ بن سکے ۔

میں نے حال میں ایک مصری محاورہ پڑھا ۔ ''لعب بدور خطیرا'' اور مجھے یہ محاورہ[۲] عربی زبان کے لیے بالکل اجنبی معلوم ہوا۔ بعد میں تحقیق

۲۔ عربی میں یہ بالکل ایسا ہے جیسے ہم اپنی زبان میں کہیں ''وہ ایک بڑے گھیرے سے کھیلا'' ۔ اور مفہوم اس کا یہ ہے کہ اس نے زبردست خدمات انجام دیں (ظا)

کرنے سے پتہ کہ یہ محاورہ صرف لکھتا جاتا ہے ۔ بولا نہیں جاتا ۔ کیوں کہ یہ ایک انگریزی ترکیب کا لفظی ترجمہ ہے Played a very important role انگریزی سے جو ترجمے عربی میں ہوئے ان میں ترجمہ کرنے والوں نے یہ پوری ترکیب یوں ہی اٹھا کر رکھ لی ۔ اب ترجموں میں یہ جوں کی توں لکھ تو دی جاتی ہے لیکن عربی زبان کا حصہ نہیں بن سکی یہ عربی زبان کے مزاج میں حل نہیں ہوئی اور نہ ہو سکتی ہے کیوں کہ عربی زبان میں یہی مفہوم ادا کرنے کے لیے دوسری گنجائشیں موجود ہیں ۔ ان گنجائشوں سے کام لیا جاتا تو انگریزی محاورے کا یہ مفہوم عربی زبان میں اور اضافہ کرتا اور اسی کا ایک حصہ بن جاتا ۔ لیکن اب یہ محض کورانہ تقلید کا ایک حصہ ہے اور بیان کے بھدے پن میں اضافہ کرتا ہے ۔

یہ ایسی بات ہے جیسے ہمارے ترجمہ کرنے والے عموماً It is going to be کو لکھتے ہیں۔"یہ ہونے جا رہا ہے" ۔ حالاں کہ عام گفتگو میں اردو زبان میں اس کے لیے "یہ ہونے والا ہے" موجود ہے۔ کسی شعر میں "ہونے والا ہے" کی جگہ ''ہونے جا رہا ہے''۔ رکھ کر دیکھا جائے۔ یا مثلاً "وطن کی فکر کر ناداں مصیبت آنے والی ہے'' ۔ ''کو مصیبت آنے جا رہی ہے''۔ لکھیے تو معلوم ہو گا کہ پوری کیفیت ہی بدل جاتی ہے۔ یوں اگر دیکھیے تو "ہونے جا رہا ہے" کا مفہوم سوائے اس کے کچھ نہیں جو "ہونے والا ہے۔" کا مفہوم ہے ۔ لیکن "ہونے والا" دراصل ہماری زبان کے مزاج کو راس آ چکا ہے اور اس کا ایک حصہ ہے ۔ یہ محض ایک لفظ کی تبدیلی کا حال ہے ۔ پورے پورے جملوں کی ساخت اور اصطلاحوں کے استعمال میں زبان کے مزاج کا اور زیادہ خیال رکھنا پڑتا ہے ۔ ورنہ وہ اوپری معلوم ہوتے ہیں اور کسی طرح کھپتے نہیں ۔

زبانوں کے اندر زبانیں

یہیں سے وہ نکتہ قابل غور ہے کہ ایک زبان کے اندر بھی کئی زبانیں ہوتی ہیں ۔ اور یہ زبانیں صرف طبقوں یا فرقوں یا ملتوں یا قبیلوں کے علیحدہ علیحدہ ہونے پر منحصر نہیں ہیں بلکہ اس میں ایک ایک فرد کے

یہاں اختلاف ہو سکتا ہے ۔ ایک ہی طبقے یا ایک ہی قومیت کے مختلف افراد ایک جگہ بیٹھے ہیں ۔ ایک شخص چودھری یا صاحب اثر ہے دوسرا ایک عام آدمی ۔ تیسرا وہ شخص جس کی بات بات میں مزاح کی چاشنی ہے اور ہنسنے ہنسانے کی کوشش چوتھا عالم فاضل قسم کی طبیعت رکھتا ہے ، اور پانچواں خانہ دار ملازم ہے ۔ کسی ناول میں اُن کی ضیافت کا تذکرہ آ جاتا ہے ۔ وہ سب اپنی اپنی بات کہتے ہیں اور ان کا ترجمہ کرنا مقصود ہے تو ظاہر ہے کہ صاحب نظر ادیب یا مصنف نے اپنی زبان میں وہاں جو جملے ان پانچوں کی زبان سے ادا کیے ہوں گے ۔ وہ پانچ الگ الگ جھلکیاں رکھتے ہوں گے ہو سکتا ہے کہ یہ ظاہر ان پانچ قسم کی گفتگوؤں کے الفاظ میں نمایاں فرق نہ ہو لیکن ان الفاظ کا پس منظر ، ان الفاظ کا لہجہ ، ان کی ادائیگی اور تلفظ اور پھر جملوں کی ساخت ایسی ہو جو ہر ایک فرد کے اپنے مزاج اور اپنی سماجی حیثیت کا پتہ دے رہی ہو۔ اب اگر ترجمہ کرنے والا ایک زبان کے اندر کئی زبانوں کے راز سے ناواقف ہے تو وہ لفظ بہ لفظ لغوی ترجمہ کرتا چلا جائے گا ۔ اور وہ جو مفہوم اور اشارے ان الفاظ کی پشت سے جھانک رہے ہیں ، ترجمے میں گم ہو جائیں گے ۔ اردو کے اکثر ترجمے میں نے ایسے دیکھے ہیں ۔ جن میں یہ نقص ناقابل برداشت حد تک پایا جاتا ہے ۔ نام لینا ضروری نہیں لیکن جن لوگوں نے ناولوں کے سب سے زیادہ ترجمے کیے ہیں ان کے ہاں یہ خاص خصوصیت سے پائی جاتی ہے ۔

زبان کے اندر زبانوں کا دوسرا مفہوم یہ ہے کہ زبان ایک ہی ہے لیکن مختلف پیشوں ، طبقوں اور مختلف زبانوں میں الفاظ و محاورات کا استعمال اور ان کی ادائیگی بدلتی رہتی ہے ۔ بائبل کے کئی مستند انگریزی ترجمے ہوئے ہیں اور یہ ترجمے لاطینی ، یونانی ، عبرانی اور انگریزی کے بڑے بڑے ماہرین نے مل کر کیے ہیں انکی خصوصیت یہ ہے کہ آسان انگریزی استعمال کرنے کے باوجود ان میں یہ خاص خیال رکھا گیا ہے ۔ کہ کلام ربانی کی شان باقی رہے اور آج تک اس کی پابندی ہو رہی ہے ۔ پروٹسٹنٹ

rekhta

تحریک جو بائبل کو دیسی زبان میں منتقل کرنے پر کفر کے فتووں کا سامنا کر رہی تھی ۔ اس نے بھی بائبل (انجیل) کا ترجمہ کرتے وقت اس نکتے کو ملحوظ رکھا اور اسی کا نتیجہ ہے کہ جب عام انگریزی عبارت میں کسی کیرکٹر کی زبان سے ایسا جملہ ادا کرانا ہوتا ہے جن میں کلام ربانی کی سی شان ہو تو اسے انجیل کے انداز بیان سے ملا دیا جاتا ہے ۔ اگر کوئی شخص اس طرح حتمی یا آخری بات کرتا ہے گویا وہ ہر راز سے ، ہر معاملے سے اتنا واقف ہے ۔ کہ اس سے زیادہ با خبر ہونا ممکن نہیں یا کوئی شخص اپنی گفتگو اور اپنے احکام میں مذہبی تقدس کی چاشنی یا اس کا سا انداز پیدا کرنا چاہتا ہے تو اس کی زبان سے ایسے جملے لکھے جاتے ہیں ۔ جو سادہ انگریزی میں ہونے کے باوجود اپنے گرد تقدس کا ہالا رکھتے ہیں اور انجیل کے جملوں ، استعاروں کہاوتوں اور ہدایتوں سے مشابہت پیدا کر لیتے ہیں ۔ اب اگر کوئی شخص انگریزی سے ان کا ترجمہ کرے تو اسے یہ بات پیش نظر رکھنی ہو گی کہ کہاں سے اصل عبارت کا انداز انجیل کی زبان سے مشابہت رکھتا ہے اور جہاں سے جملوں میں یہ صورت پیدا ہوئی ہے وہیں سے ترجمے کی عبارت میں بھی تبدیلی پیدا کرنی ہو گی ۔ اور جس زبان میں ترجمہ کیا جا رہا ہے اس زبان میں بھی اسی لب و لہجہ کے مقدس الفاظ و محاورات تلاش کرنے ہوں گے جن سے کلام ربانی کا دھوکا ہو ۔ مثلاً ایک شخص جوتشی ہے وہ کسی کا ہاتھ دیکھ رہا ہے اور اپنے معمول کو بتاتا ہے کہ یا تو تم فلاں فلاں پر ایمان لاؤ ورنہ or less ye forever be condemned اب اگر ایمان کے بجائے انگریزی لفظ confidence کا ترجمہ یقین ، بھروسہ یا اعتماد لکھ دیا گیا اور اس کے بعد والے جملے کا ترجمہ سیدھا سادا کر دیا گیا کہ "ورنہ تم ہمیشہ مصیبت میں رہو گے یا ہمیشہ تم دھتکارے جاؤ گے" تو اصل عبارت کا مقصد غارت ہو جائے گا کیوں کہ انگریزی کا جملہ خاص انجیل کی عبارت کا حصہ ہے ۔ اور اسے ترجمے میں ایسے آنا چاہیے جیسے کوئی مقدس برگزیدہ ہستی ارشاد فرما رہی ہے ۔ اور ربانی احکام پہنچا رہی ہے ۔ اس جملے کا بہتر ترجمہ یہ ہو گا ۔ "ورنہ تم پر عذاب نازل ہوتا رہے گا" ۔

اسی طرح زبان کے اندر کئی زبانیں ہوتی ہیں مثلاً ایک زبان جدید ہے، ایک قدیم ہے اور دونوں ایک ہی زبان کا حصہ ہیں ۔ فرق صرف زمانے کا ہوتا ہے ۔ میر انیس کی زبان آج بھی سند مانی جاتی ہے ۔ لیکن وہ گفتگو میں جو زبان بولتے تھے اس میں اور آج کی گفتگو کی زبان میں فرق نہ کرنا زیادتی ہو گی ۔ مثلاً وہ اپنے یہاں مجلس میں آنے والوں کی تواضع کرتے ہوئے کہا کرتے تھے 'صاحبو، جاگہ ادھر ہے۔ اب اگر اس زمانے کے شرفائے لکھنو ، کے جیسے کسی کردار کی گفتگو کا ترجمہ کرنا ہو تو ہمیں "حضرات ادھر تشریف رکھئے" نہیں بلکہ وہی لکھنا چاہیے۔ "صاحبو جاگہ ادھر ہے۔" یعنی ترجمے میں اصل عبارت کی کیفیت پیدا ہو گی قدیم وضع کے کرداروں کی زبان میں اور جدید انداز کی بات چیت اور گفتگو میں جو فرق ہمارے یہاں ہے ، ترجمے میں بھی اس کا خیال رکھنا پڑے گا ۔

ایک زبان کے اندر کئی زبانوں کی تیسری صورت یہ ہے کہ بودوباش اور معاشی حالات کا بھی زبان سے گہرا تعلق ہے ۔ ایک شخص جس کا پیشہ کاشتکاری ہے ۔ چوپال میں تقریر کرنے کھڑا ہو گا تو چاہے اس کا موضوع بھی گرام سدھار کے سوال کیوں نہ ہوں ۔ لیکن اس کی زبان میں اور شہر سے آئے ہوئے گرام سدھار افسر کی زبان میں کافی فرق ہو گا ۔ ترجمے میں اس کا فرق بھی خیال رکھنا پڑے گا ۔ اول تو اصل عبارت ہی اس فرق کو ظاہر کر دے گی ۔ لیکن ممکن ہے یہ فرق زیادہ غور کرنے سے ہی ہاتھ آتا ہو تو ایسے موقعوں پر زیادہ غور کرنے اور دونوں کی تقریر کو الگ الگ الفاظ اور جملوں سے واضح کرنے کی ضرورت پیش آئے گی ۔ کچھ لوگ آسانی اور اختصار کے خیال سے یا بے پروائی سے اس فرق کو نظر انداز کر دیتے ہیں گرام سدھار کا افسر تقریر کرنے کھڑا ہوتا ہے وہ بھی اسی قسم کی اصطلاحیں استعمال کرتا ہے ۔ زبان کی قواعد اور الفاظ کی صحیح ادائیگی کا اتنا ہی خیال رکھتا ہے اور ایک عام کھیت مزدور یا غریب کسان بھی انھی الفاظ اور اسی عبارت کو ادا کرتا ہے اگر ایسا کیا جائے تو ترجمے میں مصنوعی پن (یہ لفظ میں نے تصنع کی جگہ لکھا ہے) پیدا ہو جائے گا ۔ کیوں کہ اصل زندگی میں ایسا نہیں ہوتا ۔

یا مثال کے طور پر ایک معمولی کسان اجنبی شکاری کو اپنا مہمان بناتا ہے اور اس سے کہتا ہے ''تشریف لے چلیے ۔ نان شبینہ، تناول فرما لیجیے'' تو یہ ترجمہ اصل عبارت come in and have your dinner کا صحیح ترجمہ ہوتے ہوئے بھی غلط ہے کیوں کہ ایک زبان کے اندر کئی زبانیں ہیں دیکھنا ہو گا کہ ''ڈنر'' کا لفظ جب ایک معمولی کسان کی زبان سے ادا ہو تو اردو میں کیا ہو گا اور کسی پڑھے لکھے جاگیردار کی زبان سے ادا ہو تو کیا ہو گا ۔ رات کے کھانے کی طرف کسی کو متوجہ کرنے کے لیے دس قسم کے جملے موجود ہیں اور یہ دس قسم کے لوگ الگ الگ بولتے ہیں ۔ ہمارے یہاں کے غریب کھیت مزدور کے ہاں رات کا کھانا میز پر نہیں چنا جاتا لیکن برطانیہ کے غریب مزدور سے یہ توقع کی جا سکتی ہے اور ہمارے جاگیردار اور کھاتے پیتے زمیندار گھرانوں میں ''دستر خوان چنا جا چکا ہے'' یا ''تھال لگ گیا ہے'' یا ''خضر تیار ہے'' ''نان شبینہ حاضر ہے ایسے جملے ہیں جو مختلف معاشرت کے لوگوں میں علیحدہ علیحدہ بولے جاتے ہیں ۔ ان کئی زبانوں کا امتیاز رکھنا اور انہیں حسب موقعہ ترجمہ میں استعمال کرنا بے حد ضروری ہے ورنہ اصل کا سارا مزا کرکرا ہو جائے گا ۔

یہاں ایک واقعے کا نقل کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہو گا :-

قرآن کا ترجمہ مختلف مفسرین نے کیا ہے ۔ ان میں سب سے آسان اور روز مرہ کا ترجمہ ڈپٹی نذیر احمد مرحوم کا سمجھا جاتا ہے قرآن کو عام فہم بنانے کے لیے انہوں نے اس ترجمے میں خصوصیت سے اس بات کا خیال رکھا ہے کہ الفاظ اور محاورے عوام کی بولی کے ہوں ۔ لیکن اس کوشش میں وہ زبان کے اندر زبانوں والا نکتہ نظر انداز کر گئے ۔ اُنھوں نے سورہ اسریٰ کے ترجمے میں اس آیت کا ترجمہ جس میں رسول اللہ کے راتوں رات مکہ سے باہر تشریف لے جانے کا تذکرہ ہے ، یوں کیا کہ وہ راتوں رات سٹک گئے ۔ یہ ''سٹک'' کا لفظ اگرچہ عوام کی بول چال میں استعمال ہوتا ہے لیکن پیغمبر کی شان میں یہی لفظ ایک گستاخی سمجھا گیا اور اسی طرح کے الفاظ کی بنا پر ڈپٹی نذیر احمد کے ترجمے کے خلاف عام جلسوں میں تجویزیں پاس ہوئیں اور بہت شور مچا اس طرح سے ترجمے کا اصل مقصد ہی فوت ہو گیا ۔ سٹک

گئے کی جگہ ''نکل گئے'' یا ''باہر تشریف لے گئے'' یا ''چلے گئے'' یا ''روپوش'' ہو گئے بھی استعمال ہو سکتا تھا اور ان میں آخری لفظ اگرچہ اتنا عام فہم نہیں تھا اور پھر بھی اس مخصوص ذات کے متعلق یہ لفظ ہی زیادہ مناسب تھا ۔ اور ترجمے میں یا تو یہ لفظ یا کوئی اور ایسا ہی لفظ استعمال ہونا چاہیے تھا ۔

اصل اور نقل

ترجمہ بھی اس طرح اصل کی ایک نقل ہے جیسے مصوری یا اداکاری مصوری میں تو قلم سے اداکاری میں جسم کی حرکات و سکنات سے اور ترجمے میں زبان دانی کی صلاحیت سے کام لینا پڑتا ہے ۔ لیکن حقیقت کی کوئی نقالی مکمل طور پر نہیں ہو سکتی جب تک اس میں نقل کرنے والے کا ''جذب اندرون'' شامل نہ ہو ۔ وہ اداکاری بے روح ہو گی جو اصل کردار کو اپنے اندر جذب کرکے اور خوب رچا کر پھر سے ایک نئے وجود کو جنم نہیں دیتی جس میں اصلیت اپنی تمام خصوصیتوں کے ساتھ اُبھر کر نظر کے سامنے آئے اور نقل کا یا نقل کرنے والے کا اپنا وجود نظر سے اوجھل ہو جائے ۔

شاید ہارون رشید کے زمانے کا واقعہ ہے کہ ایک شخص کی تصویر کو بے مثل قرار دیا گیا اور وہ تصویر شاہی دربار کے دروازے پر لٹکا دی گئی کہ اگر کسی کو اس کے بے مثل ہونے میں شبہ ہو تو وہ اپنی دلیل پیش کرے تصویر یہ تھی کہ ایک انسانی ہاتھ میں انگور کا خوشہ ہے ۔ کچھ انگور پکے ہیں ، کچھ کچے تصویر کا آویزاں ہونا تھا ۔ کہ طوطوں اور چڑیوں نے اس پر ٹھونگیں مارنی شروع کر دیں ۔

لوگوں نے یہ مصوری کا کمال سمجھا کہ جانور بھی اسے سچ مچ کا انگور سمجھ رہے ہیں ۔ لیکن ایک شخص دربار میں حاضر ہوا اور اُس نے مصور کے کمال کو چیلنج کر دیا اس نے کہا کہ انگور کے خوشے تو واقعی اصلی انگور نظر آتے ہیں ۔ لیکن انسانی ہاتھ کی مصوری میں ضرور کوئی نقص رہ گیا ہے ورنہ چڑیوں کی مجال نہ ہوتی کہ وہ اس پر ٹھونگیں ماریں یعنی تصویر کے ایک حصے پر مصور کی توجہ اتنی زیادہ رہی کہ دوسرا حصہ نظر انداز ہو گیا اور نقالی میں فرق آ گیا یہ دلیل مان لی گئی ، اور تصویر اتار دی گئی ۔

rekhta

نقل وہی بے عیب اور اعلیٰ ہے جو اصل کے ہر گوشے اور ہر پہلو کو من و عن نظر کے سامنے کر دے اور وہ بھی اس طرح کہ جو امکانات اصل میں موجود ہیں بہ ظاہر نظر نہیں آتے وہ بھی نظر آنے لگیں۔

ترجمہ کرنے والے کو اصل کی نقل کرنے میں ایک مصور اور اداکار کی طرح مصنف کے ساتھ ہلاک ہونا پڑتا ہے۔ اس کے ساتھ تالیاں بجانا، ٹھٹھے لگانا اور کراہنا پڑتا ہے اور یہ سب کر لینے کے باوجود پوری طرح سنجیدہ اور لیے دیے رہنا پڑتا ہے تب جا کر ترجمہ ایک آرٹ بنتا ہے اور تخلیقی درجہ حاصل کرنے کے قابل سمجھا جاتا ہے۔ مگر دوسرے فنون لطیفہ میں اور اس ترجمے میں جو آرٹ اور تخلیق کا درجہ رکھتا ہے ایک بنیادی فرق بھی ہے شاعری اور مصوری میں مبالغہ ایک حسن ہے۔ حقیقت کو لفظوں اور تصویروں میں اصل سے بڑھا چڑھا کر پیش کرنا اور جس پہلو پر دیکھنے یا سننے والے کی توجہ مرکوز کرنی ہے اسے خوب نمایاں کرنا یا اسے اصلیت سے بالکل مختلف شکل میں اس طرح رکھنا کہ اصل تصویر یا اصل واقعے پر نظر جانے کے بجائے اس کے امکانات، اس کے اثرات، اس کے جذبات و احساسات یا مخصوص گوشوں کی حقیقت بے نقاب ہو جائے۔ جو بات اصل کی محض نقل میں نہیں ہو سکتی تھی وہ آرٹ کی اس تخلیق میں حاصل ہو جاتی ہے۔ کہ اس میں اصل کو اپنے اندر جذب کرکے ایک نئے وجود کو یا نئی تصویر یا واقعے کو جنم دینا ہوتا ہے جو اصل سے تعلق بھی رکھتا ہو اور بے تعلق بھی ہو فنی تخلیق کے اس مقصد کی خاطر ہر ایک فن کار کو کافی آزادیاں ملی ہوئی ہیں وہ "ناز و غمزہ" کی بجائے "دشنہ و خنجر" کہہ سکتا ہے۔ اور علم و دانش کے مفہوم کے لیے، اُلو کی دو گول آنکھیں بنا سکتا ہے ذرات کو آفتاب سے اور ممولے کو شاہین سے جوڑ سکتا ہے۔ لیکن ترجمہ کرنے والے کو اصل کی نقل اور اصل کے سارے امکانات پیش کرنے کے لیے یہ تمام آزادیاں میسر نہیں ہوتیں۔ وہ اپنی طرف سے نہ مبالغہ کر سکتا ہے نہ الفاظ کی رنگ آمیزی اس کا فرض "کج دار و مریز" کا ہے کہ دوڑو بھی اور پیالہ بھی چھلکنے نہ پائے۔

یہ فرض ادا ہونے کے معنی ہیں کہ ترجمہ محض ایک بے روح نقالی

نہیں رہ گیا بلکہ اصل کی ایسی نقل بن گیا جو اصل کے سارے امکانات کو بے کم و بیش اپنے اندر رکھتی ہے لیکن یہ ہو کیوں کر؟

اس کے لیے ضروری ہے کہ ترجمے میں اصل کا پورا خیال اور مفہوم اسی لوچ یا نرمی، اسی سختی یا درشتی، یا اسی جاذبیت یا دل کشی اور اسی بے کیفی یا بے رنگی کے ساتھ آئے اور اسی کا زبان و بیان بھی ہو۔

خیال و مفہوم

در اصل ترجمے کا بنیادی منشا ہی اصل کے خیال اور مفہوم کی ادائیگی ہے اور اسی منشا کو پورا کرنے کے لیے زبان کا پورا پورا علم اور مکمل اندازہ ضروری ہوتا ہے۔

اس کی تین صورتیں یا تین شرطیں ہیں:۔

۱۔ جس زبان سے ترجمہ کیا جا رہا ہے اس زبان کی لغت سے، اصطلاحات اور محاوروں سے اور کسی قدر ادبیات سے تھوڑی بہت واقفیت شرط اول ہے یہ ضروری نہیں کہ جس زبان کی تصنیف کا ترجمہ کرنا ہے اس زبان پر ترجمہ کرنے والے کو ماہرانہ عبور حاصل ہو۔ اور وہ اصل عبارت یا اصل تصنیف والی زبان میں خود بھی اسی طرح بے تکلف اور بے تکان لکھ سکتا ہو یا بول سکتا ہو بلکہ اس زبان کا صرف کتابی علم کافی ہے ورنہ خیال کی نزاکتیں ہاتھ سے نکل جائیں گی اصل عبارت کی نوک پلک پر ترجمہ کرنے والے کا دھیان نہیں جائے گا اور وہ اسے ترجمے میں منتقل کرنے کی طرف سے غافل رہے گا۔

اگر اصل تصنیف یا اصل عبارت کی زبان کا علم صرف کتابی نہیں بلکہ اس سے کچھ زیادہ ہو تو اور اچھا ہے۔ جتنا زیادہ ہو اتنا ہی اچھا، لیکن کم از کم اتنا ضرور ہو کہ وہ اصل عبارت کے سیاق و سباق کو سمجھ سکے یا پا سکے کہ فلاں قسم کا لفظ نظر انداز کرکے فلاں لفظ مصنف نے خاص اس مقصد سے رکھا ہے یہ مقصد اگر سمجھ میں آ جاتا ہے تو ترجمہ کرتے وقت اس زبان میں جس میں ترجمہ کیا جا رہا ہے اس مقصد کو کسی ہم پلہ لفظ سے پورا کیا جا سکے گا ورنہ نہیں۔

rekhta

اس مسئلے میں لغت کام تو دیتا ہے مگر کم ۔ جو چیز لغت سے زیادہ کار آمد ہے وہ ہے اس زبان کے ادب کا عام مطالعہ جس سے ترجمہ کیا جا رہا ہے مثال کے طور پر میرے سامنے اردو کا ایک تازہ ترین ترجمہ رکھا ہوا ہے جس کا موضوع سیاسی بحث ہے اس کا ترجمہ کرنے والے خود ایک سیاسی "سوجھ بوجھ" کے آدمی ہیں اپنی زبان پر انہیں کافی قدرت حاصل ہے اور وہ اپنی زبان میں بے عیب لکھ اور بول سکتے ہیں لیکن ترجمے میں کئی گوشے خالی پڑے ہیں 'اصل کتاب' روسی زبان میں لکھی گئی ۔ وہاں سے انگریزی میں ترجمہ ہوئی۔ انگریزی سے اردو میں لائی گئی۔ انگریزی عبارت میں ایک جگہ لکھا ہے کہ یہ آئین چھوٹی بڑی قوموں کے **Equilibrium** پر قائم ہے ۔ اب اگر لغت کھول کر دیکھا جائے تو "اکوی لی بریم" کے معنی ملیں گے توازن ۔ غیر جانبدارانہ حالت وغیرہ ۔ ذی علم ترجمہ کرنے والے نے یہی لفظ وہاں اٹھا کر رکھ دیئے ہیں حالانکہ اگر مفہوم محض توازن یا غیر جانبداری ہی ہوتا تو **Balance** یا **state of neutrality** لکھا جا سکتا تھا ۔ اصل مصنف نے ان الفاظ کو رد کر کے خصوصیت سے **Equilibrium** لکھا تو اس کے پورے مفہوم میں کچھ اور بھی شامل ہے ۔ کیا شامل ہے ؟ یہ بات پوری عبارت سے اور اس لفظ کے سارے امکانات کو جاننے سے ہی معلوم ہوتی ہے اس میں غیر جانبداری اور توازن کے ساتھ آپس کے برادرانہ تعلقات اور ہم آہنگی کا مفہوم بھی رکھا گیا ہے چنانچہ ایسے موقعہ پر "اکوی لی بریم" کا ترجمہ اگر "جذب[۳] باہم اور ہم آہنگی" کیا جائے ۔ تو مصنف کے مفہوم کو پوری طرح ادا کر سکے گا ۔

۲۔ دوسری شرط یہ ہے کہ جس زبان میں ترجمہ کرنا ہے ۔ اس پر ماہرانہ عبور حاصل ہو ۔ اصل تصنیف کی زبان سے زیادہ قدرت اس زبان میں ہونی چاہیے ۔ جس میں ترجمہ کرنا مقصود ہے ۔ یہاں تک کہ اس زبان میں خود لکھ لینے کی پختہ مشق ہونی چاہیے ۔ اور اس زبان کا پورا پورا علم

۳۔ ظاہر ہے کہ یہ لفظ ہمیں علامہ اقبال کے ادب سے مل جاتا ہے
"جذب باہم جو نہیں ۔ محفل انجم بھی نہیں"

ہونا چاہیے ۔ زبان کے پورے علم سے مراد یہ کہ اس کے ماخذ کا جہاں جہاں سے وہ چلی ہے ان سرچشموں کا ان کے نشیب و فراز کا علم ہو ۔ الفاظ کہاں سے آئے ۔ کیوں کر آئے ۔ ان کے لغوی معنی کیا تھے ۔ اصطلاحی معنی کیا ہو گئے ۔ اور کیا کیا ہو سکتے ہیں ۔ ان کی ترکیبیں اور محاورے کیوں کر بنے ، انہیں مختلف موقعوں پر کیسے کیسے استعمال کیا گیا ۔ اور آئندہ کیسے استعمال کیا جا سکتا ہے ان میں مختلف اوقات میں کیا تبدیلیاں ہوئیں اور ان تبدیلیوں کی بنیاد پر اور کیا تبدیلیاں ممکن ہیں ۔ ان کی مدد سے اور نئے سانچے کیسے بن سکتے ہیں ۔ ایک ہی لفظ کتنے مفہوم اپنے دامن میں رکھتا ہے اور ایک ہی مفہوم کو جب مختلف چیزوں کی نسبت سے ادا کیا جائے تو اس کے لیے کتنے الفاظ علیحدہ علیحدہ موجود ہیں ۔

یہ باتیں جاننے کے لیے عمر نوح کی ضرورت نہیں ہے ۔ اور نہ یہ کہ پہلے ایک زبان کو آخری تہہ تک کھنگال ڈالنے اور غوطے لگانے سے فراغت حاصل کر لی جائے ۔ اور اس کے بعد ترجمے کے لیے قلم اٹھایا جائے ۔

کسی زبان کا اس درجہ عالم ہونا دراصل ایک ارتقائی عمل ہے ۔ یہ دھیرے دھیرے ہوتا رہتا ہے اور اگر توجہ رکھی جائے تو ترجمے کے دوران ہی ہوتا رہتا ہے لیکن اگر اس بوجھ کو غیر ضروری سمجھ کر ڈال دیا جائے تو کبھی نہیں اٹھتا ۔ لوگوں کی عمریں گزر گئیں ترجمے کرتے کرتے ، لیکن وہ اب تک اس قابل نہیں ہوئے کہ جس زبان میں روزانہ ترجمہ کرتے ہیں اس زبان کے الفاظ ، محاورات ، ترکیبوں ، استعاروں اور تلمیحوں کا پورا مفہوم سمجھ سکیں خود لکھنا تو درکنار ۔

اس ارتقائی عمل کی پہلی منزل یہ ہے کہ جس زبان میں ترجمہ کرنا ہے اس زبان کے ادب سے واقفیت حاصل کی جائے اور جتنا ممکن ہو قدیم اور جدید ادب کا مطالعہ بڑھایا جائے ۔ ادب ایسا وسیع دائرہ ہے ۔ کہ اس میں مختلف موضوعات کسی نہ کسی سمت سے آ ہی نکلتے ہیں اور اس طرح مختلف موضوعات اور شعبوں سے مثلاً معاشیات ، تاریخ ، عمرانیات ، جغرافیہ

rekhta

اور مذہبیات ، سیاسیات وغیرہ کی اصطلاحوں اور ترکیبوں سے جان پہچان بڑھتی ہے بیان کی نئی نئی صورتیں نئے نئے اسلوب معلوم ہوتے ہیں اور پھر آسانی ہو جاتی ہے کہ پڑھنے والے کا رجحان جدھر زیادہ ہو ۔ وہ اسی طرف رخ کرے اور اسی موضوع کی کتابوں کا اور مباحث کا مطالعہ اختیار کر لے جب یہ صورت ہو جاتی ہے تو اسی شعبے یا موضوع کی کتابوں کا ترجمہ آسان نظر آنے لگتا ہے ۔ اور پھر جب اس موضوع پر مستقل تصانیف یا مضامین کا ترجمہ کوئی کرنے بیٹھے تو اسے یہ مدنظر رکھنا چاہیے کہ جن جن الفاظ کی خصوصیت سے اس کو ضرورت پڑے گی ۔ یا جن سے پہلا واسطہ پڑے گا ساتھ ساتھ ان کی تحقیق کرتا جائے گا ۔ تو خود ہی اگلی منزلیں آسان ہوتی چلی جائیں گی ورنہ روز مرہ استعمال کے لفظوں کی طرف سے بھی غفلت برتنے کی عادت ہو جاتی ۔ یہ عادت ترجمے کے کام پر برا اثر ڈالتی ہے اور ادنیٰ ادنیٰ غلطیوں سے بھرے ہوئے کڈھب ترجمے ہونے لگتے ہیں ۔ مثلاً ابھی چند روز ہوئے کئی زبانوں سے باخبر ایک ترجمہ کرنے والے نے ٹیگور کے ڈرامے "اچلیاتن" کا ترجمہ لکھا ہے۔ "لڑکھڑاتا ہوا گھر" ظاہر ہے یہ بے پروائی کا نتیجہ ہے ۔ یہ بے پروائی مستقل ہو جائے تو نادانی اور بے خبری بن جاتی ہے "اچلیاتن" بنگالی لفظ ہے جس کے معنی ہیں وہ گھر جس کی دیواریں بوسیدہ ہو چکی ہوں چھت بیٹھ چکی ہو اور یہ گھر اگرچہ بظاہر درو دیوار سے محروم نہ ہوا ہو لیکن جلد ہی وہ کھنڈر میں تبدیل ہونے والا ہو لہذا "اچلیاتن" کا ترجمہ اگر ایک نئی ترکیب یا وہ لفظوں میں ہی کرنا تھا تو اسے "ڈھیتا ہوا گھر" یا "گرتا مکان" کہہ سکتے تھے لڑکھڑاتا وہ ہے جو چلتا ہے لڑکھڑانا ، ڈگمگانا ڈانواں ڈول ہونا اور ڈھینا یا بیٹھنا اپنے ساتھ الگ الگ نسبتیں رکھتے ہیں کسی لفظ کی نسبت شرابی اور مدہوش سے ہے ، کسی کی نسبت کمزور اور ناتواں سے ، کسی لفظ کی چول ٹھیک بیٹھتی ہے ۔ کشتی یا جہاز کے ساتھ ۔ اور کسی کا رشتہ مکان یا دیوار سے ہے یہ الگ الگ نسبتیں ترجمہ کرتے وقت ذہن میں رہنی ضروری ہیں اور یہ خود بہ خود معلوم ہو جاتی ہیں اگر لوگوں

کی بولی پر ادب کے مطالعے پر زبان و بیان کے اچھے نمونوں پر ، صاحب طرز ادیبوں کے طرز ادا پر اور اپنے کام کی ذمہ داری پر نظر رکھی جائے ورنہ بالکل ممکن ہے کہ ترجمہ کرنے میں مترجم قدم قدم پر خود لڑکھراتا رہے یہیں سے ایک سوال کا حل اور ملتا ہے کہ جس زبان میں ترجمہ کیا جا رہا ہے ۔ ممکن ہے اس میں اصل عبارت جیسے ٹکے بد ہے الفاظ یا مستقل اصطلاحیں اور محاورات یا ترکیبیں موجود نہ ہوں اگر زبان کا دامن ایسے اجزاء سے خالی ہے تو ترجمہ کرنے والے کی ذمہ داری اور بڑھ جاتی ہے ۔ یہ ذمہ داری ادا ، تو ترجمے کا مقام اور اونچا ہو جاتا ہے اور اس کے ساتھ ترجمہ کرنے والے کی صلاحیت بڑھتی چلی جاتی ہے یہ ذمہ داری ہے اس بات کی کہ پرانی ترکیبوں کی مدد سے نئی ترکیبیں اور پرانے الفاظ کے سہارے سے نئے الفاظ تراشتے جائیں ۔

مثال کے طور پر ۱۹۴۵ء کے اختتام پر انگریزی اخبارات میں ایک لفظ استعمال ہونا شروع ہوا ہے **warmonger** اس کا ترجمہ "جنگ جو" صحیح ہو سکتا ہے "نہ لڑائی پھیلانے والا" دونوں لفظوں کا مفہوم **(warmonger)** کے سوا بھی ہے لیکن وہ لوگ "جو وارمونگر" کے مفہوم سے تو واقف تھے مگر یہ نہیں جانتے تھے کہ اردو ہندی میں اسے کس طرح ادا کیا جا سکتا ہے ۔ اسے کبھی آدھے جملوں میں اور کبھی غلط ملط لفظوں میں ادا کرتے رہے ہندی اور گجراتی زبانوں میں وہ جنگ خور رہ گیا (یہ خور کی ترکیب کہاں سے آئی بجائے خود دلچسپ بات ہے)۔ لیکن اردو میں ایک بار میں نے اسے جنگ باز لکھنے کی جرأت کی یہ ترکیب ہماری زبان کے لیے بالکل نئی تھی ، ایک بے جوڑ یا اجنبی نہیں تھی اس کے پیچھے جتنی گندی عادتوں کی بازیاں ہیں سب کی غلاظت چھپی ہوئی تھی ۔ اور مفہوم قطعاً وہی نکلتا تھا "جو وار مونگر" کا ہے نتیجہ یہ کہ اب یہی لفظ استعمال ہوتا ہے اور اس طرح اردو زبان میں ترجمے کے ذریعے جہاں اور ہزاروں لفظ آئے ہیں وہاں یہ لفظ بھی شریک ہو گیا ہے ۔

اسی طرح کی ایک اور مثال سے عربی میں ایک ترکیب ہے۔ "معرض الی اشاقة" یا "شائق الصعب" یعنی وہ شخص جو مصائب اور مشکلات کی طرف

لپکتا ہو اتنے بڑے محاورہ کی جگہ اگر اردو ادب سے واقفیت ہو تو غالب کی استعمال کی ہوئی محض ایک ترکیب کافی ہے دشوار[1] "یا مشکل پسند"[2] اب اس سے بنا کر وہ شخص جس کی پسندیدگی حاصل کرنا بہت مشکل ہو یا وہ جس کا ذوق نظر اتنا بلند اور اتنا انوکھا ہو کہ کہیں آکر ٹھہرتا نہ ہو اور جس کی پسند یا نگاہ انتخاب بڑی مشکل سے کسی چیز پر مبنی ہو۔ **Fostidians** یا **squimish** اس کے لیے عموماً اب تک ایک ترکیب تنک مزاج یا نازک مزاج استعمال ہوتی رہی ہے لیکن اس ترکیب میں وہ خوبی اور وہ جامعیت نہیں ہے جو "دشوار پسند" میں ہے اب اگر اردو ادب کا رچا ہوا ذوق ہے اور الفاظ کی ساخت اور ترکیبوں کی بناوٹ پر نظر ہے تو ترجمہ کرنے والا ایسے موقع کے لیے "پسند[3] دشوار" کا لفظ ایجاد کرے گا اور اسے ایسے ڈھب سے استعمال کرے گا کہ مفہوم بھی واضح ہو جائے اور زبان میں ایک اچھی ترکیب بھی بڑھ جائے اور پھر اسی ترکیب "پسند دشوار سے پسند دشواری" (صفت) بنائی جا سکتی ہے۔

مگر ترجمے کی اس شرط کو پورا کرنے کے لیے پھر میں دہراؤں گا کہ اس زبان کا گہرا علم اور اچھا سلجھا ہوا ذوق رکھنا ضروری ہے جس زبان میں ترجمہ کیا جا رہا ہے۔

۳۔ تیسری شرط خیال اور مفہوم کی پوری ادائیگی کی یہ ہے کہ جس موضوع کی اصل ہے اس موضوع سے مناسب حد تک واقفیت ہو۔ کیوں کہ یہ بھی ہوتا ہے۔ کہ ایک ہی اصطلاح یا ایک ہی ترکیب یا ایک ہی

۱۔ نو آموز فنا ہمت و شعراء پسند۔ سخت مشکل ہے کہ یہ کام بھی آسان نکلا۔

۲۔ شمار سبحہ مرغوب بت مشکل پسند آیا۔ تماشائے بہ یک کف بردن صد دل پسند آیا۔

۳۔ لفظ ایسے کردار کے لیے استعمال ہو گا۔ جس کا تذکرہ حالی کے اس شعر میں آیا ہے۔ ہے جستجو کہ خوب سے ہے خوب تر کہاں۔
اب ٹھہرتی ہے دیکھیے جا کر نظر کہاں

لفظ ادب میں کچھ اور معنی رکھتا ہے۔ معاشیات میں اس کے معنی کچھ اور ہو جاتے ہیں۔ اور نفسیات میں اس کا الگ مستقل مفہوم ہے اور تاریخ میں وہ محض لغت کے ایک عام لفظ کی طرح استعمال ہوا ہے اب اگر ترجمہ کرنے والے کو یہ معلوم نہیں ہے کہ فلاں فلاں ترکیب اس موضوع کی خاص اصطلاحیں ہیں اور ان کا اس شعبے یا اس علم میں الگ الگ مفہوم ہے تو وہ لغت کی مدد سے ترجمہ کر دے گا اور عبارت کے سارے مفہوم کو غارت کر دے گا۔ یہاں تک کہ اگر خود اس سے کہا جائے کہ تم اپنا ترجمہ پڑھ کر اس کا مطلب سمجھاؤ تو وہ نہیں سمجھا سکے گا مثال کے طور پر **surplus** اور **value**[1] دونوں الفاظ عام طور پر روزمرہ کی انگریزی میں استعمال ہوتے ہیں اور اگر کسی عام عبارت میں آئیں تو پہلے کا ترجمہ "فالتو" یا ضرورت سے زیادہ لکھ دینا مناسب ہو گا اور دوسرے کا قدروقیمت درجہ حیثیت، وقعت وغیرہ ہوتا ہے۔ لیکن اب اگر یہی الفاظ 'پولیٹکل اکانومی' معاشیات کی کسی کتاب میں آئے ہیں اور مترجم معاشیات سے بالکل بے بہرہ ہے تو ان کی اصطلاحی اہمیت پر اس کی نظر نہیں جائے گی اور وہ ترجمے میں "فالتو حیثیت یا" ضرورت سے زیادہ وقعت لکھ جائے گا۔ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ایسا ترجمہ کس کام کا ہے اور وہ اصل عبارت کو مسخ کرنے کے علاوہ کیا خدمت انجام دے سکتا ہے۔

اردو زبان کے ایک پروفیسر نے ایک تنقیدی کتاب پر انگریزی میں مضمون لکھا۔ اردو کی اس تنقیدی کتاب میں جا بہ جا ادبی تنقید کی اصطلاحیں مثلاً واقفیت نگاری اور حقیقت نگاری استعمال ہوئی تھیں۔ انہوں نے ترجمہ کرتے وقت دونوں اصطلاحوں کے صرف لغوی مفہوم ٹٹول کر دونوں کو ہم معنی سمجھا اور ان کے لیے اپنے انگریزی تبصرہ میں

۱۔ **surplus value** سرپلس ویلیو سیاسی معاشیات میں کارل مارکس کی لائی ہوئی ایک اصطلاح ہے۔ اس کا ترجمہ "قدر زائد" کیا گیا ہے۔ اور اس کا مفہوم ایک جملے میں یہ ہے کہ مزدور کی اس محنت کا حاصل جس محنت کی مزدوری اسے نہیں ملتی۔

"Fact finding" کی ترکیب استعمال کی جو در اصل کسی سرکاری رپورٹ یا کسی کالج کی ریسرچ سوسائٹی کے معاملات میں استعمال ہونا چاہیے تھی ۔ "حقیقت نگاری" اور "واقعیت نگاری" کا فرق تو ترجمے کی عبارت سے غائب ہوا ہی تھا اب یہ دونوں جو ادبی تحریکیں اور ادبی رجحان ہیں ۔ ان کا مفہوم بھی رخصت ہو گیا ۔ کیوں کہ Realism۔ اور naturation کو "فیکٹ فائنڈنگ" سے دور کی بھی نسبت نہیں ہے ۔ حالاں کہ اردو سے انگریزی میں ترجمہ کرنے والے پروفیسر انگریزی پر اچھا خاصہ عبور رکھتے ہیں ، اردو کی تعلیم دیتے ہیں اور دونوں زبانوں سے مناسب حد تک واقف ہیں مگر چوں کہ وہ اس موضوع سے واقف نہیں تھے جس موضوع کی اصل عبارت تھی اس لیے وہ بھٹک گئے ۔

یہ تو بہت معمولی مثالیں ہیں ، ترجموں کے معاملے میں اصل تصنیف کے موضوع سے بے خبری نے بڑے عبرتناک نتیجے پیش کئے ہیں اور ان موضوعات پر اپنی زبانوں میں اضافہ کرنے کے بجائے ان کی طرف پڑھنے والوں کی توجہ کو بری طرح تکلیف پہنچائی ہے ۔

ایک شخص ادب سے واقف ہے اور فلسفہ نہیں جانتا یا فلسفے کے موٹے موٹے اصولوں سے بے خبر ہے تو وہ برٹرنڈرسل کی کتاب کا ترجمہ کرتے وقت برٹرنڈرسل کی صورت تو مسخ کرے گا ہی لیکن خود اس زبان میں فلسفے کے مضامین سے لوگوں کو نفرت دلائے گا ۔ جس زبان میں ترجمہ کر رہا ہے ۔ ایک شخص سیاست کے میدان کا کھلاڑی ہے ۔ لیکن ادب کی چاشنی سے بہت کم واسطہ رکھتا ہے تو وہ مائیکل شولوخاف کے ناول "ڈان بہتا رہا" کی ادبی نزاکتوں پر پانی پھیر دے گا ۔ یا جہاں ترجمے میں اٹکاؤ آئے گا ۔ وہاں سے چھلانگ لگا جائے گا(۲)۔

جو لوگ کسی خاص موضوع کی کتاب یا مضمون سے گہری دلچسپی نہ رکھتے ہوں یا اس کے متعلق بنیادی معلومات حاصل نہ ہوں انہیں صرف زبان دانی کے بل پر اس موضوع کے ترجمے سے نہیں کھیلنا چاہیے اور اگر

۲۔ روئے سخن کسی کی طرف ہو تو روسیاہ" (ظ)

وہ کسی وجہ سے ایسے موضوعات کی تصانیف کا ترجمہ کرنے پر مجبور ہوں تو انہیں ایک ایک لفظ کو خوب ٹھونک بجا کر دیکھ لینا چاہیے ۔ کہ کہیں ان الفاظ و تراکیب سے اس موضوع کا کوئی خاص رشتہ تو نہیں ہے اگر ہے تو پھر اس موضوع کی لغت یا ماہرین سے مشورہ لے لینا چاہیے ۔ بہتر یہی ہے کہ مختلف ترجمہ کرنے والے اپنی دل چسپی اور اپنی گوں کے مضامین الگ الگ رکھیں اور اسی قسم کی تصانیف یا مضامین کا ترجمہ اپنے لیے مخصوص کر لیں ۔ اس سے ترجمہ کرنے والے کا بھی فائدہ ہے ترجمے پڑھنے والوں کو بھی سہولت ہے اور جس کا ترجمہ کیا جائے گا اسے بھی سود و زیاں کا خطرہ نہ رہے گا ۔

یہیں سے ایک نکتہ اور پیدا ہوتا ہے کہ موضوع اور اصل عبارت کے مضمون سے کیا مراد ہے ؟ اس سے مراد صرف اتنی ہی نہیں ہے کہ اگر عبارت معاشیات کی ہے تو معاشیات کی چند اصطلاحیں جان لی جائیں یا اگر ادبی موضوع ہے تو پہلے سے ادبی ذوق اور ادبی سوجھ بوجھ پیدا کی جائے اصل موضوع سے واقفیت کے معنی کچھ اور بھی ہیں ۔ اس کے یہ بھی معنی ہیں کہ اگر کسی صاحب طرز ادیب یا مخصوص رجحان اور خاص ذہنیت کے مصنف کی تصنیف کا ترجمہ کرنا ہے تو اس ادیب یا مصنف کے طرز رجحان اور ذہنیت کی خبر ہو ۔ ضروری نہیں کہ پہلے سے اس کی تمام تصانیف کا ورد کیا جائے بلکہ یہ کافی ہے کہ اس کی سوانح عمری ، یا زندگی کے خاص خاص حالات اور اس کے طرز بیان اور رجحان کے متعلق دوسروں کی رائیں معلوم کر لی جائیں ۔ یہ بھی اگر ممکن نہ ہو یا بہت مشکل ہو تو آسان صورت اور کم از کم شرط یہ ہے کہ جس تصنیف کا ترجمہ کرنا ہے اسے خوب غور سے ایک بار اول تا آخر پڑھ لیا جائے اور اگر ویسی ہی دو ایک تصانیف اور ہاتھ آ سکیں تو ان کا بھی مطالعہ کر لیا جائے اور اگر زیر ترجمہ تصنیف پر دوسروں کی رائیں ، تبصرے یا تنقیدیں یا تعارف مل سکیں تو ان پر بھی ایک نظر ڈال لی جائے ۔ اور اس کے بعد ترجمہ شروع کیا جائے ۔

بعض ذمہ دار لوگ بھی اس شرط کی اہمیت کو نہیں مانتے ، ترجمہ یہ کہ وہ اصل تصنیف کے ان اشاروں ، کنایوں اور نکتوں کو نظر انداز کر جاتے ہیں جن سے پوری تصنیف کا لطف یا اس کی اہمیت قائم ہے ۔

برنارڈ شا کا ایک شہرہ آفاق ڈراما ہے ۔ "man and superman" اس ڈرامے کا ترجمہ ہوا ہے ۔ نکتہ چیں ہے غم دل ۔ ۔ ۔ کے نام سے ہوا ہے مترجم اس سے پہلے کئی اچھے ترجمے کر چکے ہیں اور انہیں انگریزی اور اردو دونوں زبانوں پر اچھا عبور ہے لیکن وہ ڈرامے کے اصل موضوع کو بھلے سے جانتے اور خوب ذہن نشین کر لینے کو شاید اہمیت نہیں دیتے اور اصل موضوع کو ذہن نشین کر لینے کے سلسلے میں جو پہلو نکلتا ہے کہ مصنف کے طرز بیان ، رجحان اور ذہنیت سے واقفیت حاصل کر لی جائے اسے اپنے اکثر ہم عصروں کی طرح انہوں نے بھی بالکل نظر انداز کیا ہے چناں چہ جب وہ شا کے اس زبردست ڈرامے کا ترجمہ کرنے بیٹھتے ہیں تو پڑھنے والوں کی آسانی کی خاطر انگریزی ناموں کو بدل کر اُن کی جگہ ہندوستانی اور وہ بھی متوسط طبقے کے مسلم نام رکھ دیتے ہیں نتیجہ اس کا یہ ہوا ہے کہ اصل اور ترجمے کے پورے ماحول اور تاثر میں اتنا فرق ہو گیا ہے جتنا اس انگریز میں ہو سکتا تھا ۔ جو لندن چھوڑ کر نظام شاہی حیدر آباد میں چلا آتا اور درمیانی درجے کے کھاتے پیتے مسلم گھرانے کی معاشرت اختیار کر لیتا ۔

برنارڈشا خود آئر لینڈ کا باشندہ ہے آئرلینڈ اور انگلینڈ میں رقابت اور چشمک بہت پرانی ہے لہٰذا اس کا آئرش ہونا کہیں نہ کہیں کوئی شوشہ چھوڑتا ہے ۔ کبھی وہ انگریزی زبان سے آئرش کے خلاف کوئی احمقانہ جملہ کہلواتا ہے کہیں کسی آئرش کی زبان سے انگریز پر جملہ کستا ہے کہیں آئرش کی برتری دکھاتا ہے اور کہیں ان کی بود و باش اور مزاج پر طنز کر دیتا ہے اب اگر کوئی شخص شا کے اس ڈرامے کا ترجمہ کرتے وقت انگریز ناموں کی جگہ ہندوستانی مسلمان نام رکھ دے تو لا محالہ اسے شہروں کے نام ، فرنیچر کے نام اور دوسری ضروریات کے نام بھی بدلنے پڑیں گے پڈنگ کو کھیر بنانا ہو گا اور Pork کو معلوم نہیں کیا کرنا ہو گا اور

جب یہ صورت ہو گی تو ظاہر ہے کہ انگلش کو ہندوستانی اور آئرش کو مصری یا تبتی یا چینی لکھنا پڑے گا ۔ مثلاً اگر شا نے جملہ یوں لکھا ہے کہ جی ہاں یہ آئرش لوگ ہوتے ہی ہیں بہت ضدی ، اور یہ جملہ ایک انگریز کہہ رہا ہے تو انگریز کی جگہ ہندوستانی آئرش کی جگہ تبتی لکھ کر ترجمے کی جو تباہی ہو گی ہر خوش مذاق آدمی اس کا اندازہ کر سکتا ہے مجھے نہیں معلوم کہ شا کو سمجھنے کے لیے ایسا ترجمہ کتنا مفید ہو سکتا ہے ۔

ترجمے کا یہ نقص پیدا اسی لیے ہوتا ہے کہ ترجمہ کرنے والے کا اصل موضوع سے با خبر ہونا اور پھر اصل عبارت کے مصنف کے رجحان اور طرز کے نکتے معلوم کرنا کچھ ایسا ضروری نہیں سمجھا جاتا ۔ حالاں کہ یہ بھی تقریباً اتنا ہی اہم ہے جتنا اس زبان کا علم ہونا جس سے ترجمہ کیا جا رہا ہے ۔

ترجمے کی بندشیں

ترجمے میں اصل کے خیال و مفہوم کو پوری طرح ادا کرنے کے سلسلے میں جن شرائط کا ذکر آیا ہے اگر وہ تمام پوری بھی ہوں تب بھی ترجمے کرنے والے کو جگہ جگہ بعض اور سوالوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے ۔

مثلاً ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے اور یہ کافی اہم سوال ہے کہ جہاں اصل عبارت کا مفہوم صاف نہ ہو اور خود اصل کی عبارت ذرا الجھی ہوئی یا اس طرح لکھی گئی ہو کہ ایک کے بجائے کئی معنی نکلتے ہوں وہاں اپنے پڑھنے والوں تک بات پہنچانے کے لیے ترجمہ کرنے والے کا کیا فرض ہے ؟

کیا اسے حق پہنچتا ہے کہ وہ اپنی طرف سے اضافہ کر کے مطلب کو صاف کر دے ؟ یا وہ جو کئی مفہوم نکلتے ہیں ۔ ان سب کو ویسے کے ویسے ہی لکھ دے؟ یا ترجمے میں بھی عبارت کو اتنا ہی گنجلک اور کثیر المعانی رہنے دے ؟

یہ تمام شکلیں مختلف ترجمہ کرنے والوں نے اپنے اپنے طور پر آزمائی ہیں ۔ اور ان میں سے کوئی ایک صورت مسئلے کا آخری حل نہیں ہے ۔

rekhta

ایسی صورتوں کا حل بڑی حد تک اس موضوع پر موضوع کے اس اس حصے پر اور اصل مصنف کے بیان پر منحصر ہے :-

۱- ممکن ہے عبارت کا اصل مفہوم اس لیے صاف نہ ہو کہ مصنف کی بیانیہ کمزوری سے وہ الجھا رہ گیا ہو اگر مصنف کو قدرت ہوتی یا اسے معلوم ہوتا کہ فلاں جگہ اس کی عبارت گنجلک ہے تو وہ اسے زیادہ وضاحت اور سلاست کے ساتھ بیان کرتا ۔ اگر یہ صورت نظر آئے تو ترجمہ کرنے والے کی قابلیت اس میں ہے کہ ترجمے میں اپنی طرف سے کچھ الفاظ کا یا انداز بیان کا اضافہ کرکے انھیں ایسے لکھے کہ عبارت سلجھ جائے ۔

۲- ممکن ہے اس مقام پر عبارت کو گنجلک رکھنے کا کوئی خاص مقصد ہو ۔ بعض موقعوں پر یہ بات ضروری ہوتی ہے ۔ خاص طور سے شاعری میں ایسے مقامات آتے ہیں جہاں پر نکتے کو سلجھانا ضروری نہیں ہوتا ۔ آرٹ میں بعض جگہ تاریک گوشے اصل مقصود کو نمایاں کرنے کا ذریعہ ہوتے ہیں یا بعض جگہ ہلکے سے پردے کسی مجبوری کی وجہ سے ڈال دیئے جاتے ہیں ۔ صاف بات اگر کہی جائے تو اسے پڑھنے والوں کی سوجھ بوجھ برداشت نہیں کرے گی ۔ یا حکومت برداشت نہیں کرے گی یا مذہبی اور اخلاقی ادارے چراغ پا ہو جائیں گے ۔ یا بیان کے حسن میں فرق آ جائے گا ۔ اور لذت کم ہو جائے گی ان وجہوں سے بھی یہ ہو سکتا کہ اصل مصنف نے اپنی عبارت کو کس قدر ڈھکا چھپا رہنے دیا ہو ۔ ایسے مقامات کا اور مصنف کے اس مقصد کا اندازہ لگا لینا ترجمہ کرنے والے کے دل و دماغ اور اچھی صلاحیت پر منحصر ہے اگر وہ اسے پا لیتا ہے کہ یہاں عبارت کو اور زیادہ واضح کرنے اور عام فہم بنا دینے سے اصل عبارت کی وہ ادائے حجاب جاتی رہے گی جو مصنف کا منشا ہے تو اسے مصنف کے منشا کی پابندی کرنی چاہیے اور عبارت کو جوں کا توں اپنی زبان میں منتقل کرنا چاہیے ۔ جیسے دلہن کو ایک ڈولی سے دوسری ڈولی میں پہنچاتے ہیں۔ اور اگر ایسا نہ ہوا تو یہ ترجمہ ترجمہ نہ رہے گا ۔ بلکہ اصل عبارت کی تفسیر بن جائے گا ۔ اور ترجمہ تفسیر میں جو بنیادی فرق ہے ۔ وہ ظاہر ہے ۔ تفسیر مصنف کے منشا کو اپنے طور پر بیان کرتا ہوتا ہے مفسر کو

مترجم کے مقابلے میں بہت آزادی ہے اور مفسر سے اختلاف کی گنجائش بہ نسبت مترجم کے زیادہ ہوتی ہے ۔

۳- اب اگر کہیں مترجم دیکھتا ہے کہ اصل عبارت میں فلاں حصہ ایسا ہے کہ اس کے کئی معانی نکل سکتے ہیں تو اسے سوچنا ہوگا کہ مصنف خود اس مقام پر کئی معانی پیدا کرنا چاہتا تھا وہ ایک رنگ میں کئی ہلکے ہلکے رنگوں کی آمیزش رکھنا چاہتا تھا یا اس کے ذہن میں اپنا ایک مفہوم تھا ۔ اور وہ لفظ یا جملہ ایسا لکھ گیا ۔ جس سے بہ یک وقت کئی شعاعیں پھوٹتی ہیں اور بیان کی یک رنگی یا وضاحت میں حائل ہوتی ، ہیں ۔ یہاں پھر مصنف کے منشا کی پابندی کرنی ہوگی اگر پہلی صورت ہے تو اسے اپنی زبان میں ترجمے کے لیے ویسا ہی لفظ یا ویسا ہی محاورہ ڈھونڈھنا ہوگا جو کئی کئی معانی کی طرف اشارہ کرتا ہو اور اگر دوسری صورت ہے تو اسے اصل عبارت کی حدود سے آگے بڑھ کر ایسا لفظ تراشنا ہوگا ۔ جو چاہے لفظی ترجمہ ہو یا نہ ہو ۔ لیکن اس ایک مفہوم کے لیے سب سے زیادہ جامع اور مانع وہی ہو اسے اپنے ترجمے میں اصل کی عبارت یا جملے سے باقی تمام مفہوموں کو راستے سے ہٹانا ہوگا ۔ اور صرف ایک کو آگے بڑھانا ہوگا - ممکن ہے بعض لوگ اس پر اعتراض کریں اور اسے ترجمہ کرنے والے کی دیانت داری کے خلاف سمجھیں لیکن ترجمے کی دیانت داری کا مطلب ہرگز یہ نہیں ہے کہ مترجم اصل کے لفظ کی جگہ لفظ لکھتا چلا جائے ۔ اور مکھی پر مکھی مارتا رہے ۔

جن لوگوں نے مکھی پر مکھی مارنے کو ترجمے کی دیانت داری سمجھا ہے ان کی مثال ایک ایسے، روکھے سخت گیر آدمی سے دی جا سکتی ہے ۔ جس نے بہتر کردار بنانے کی خاطر کچھ اصول بنائے ہوں اور وہ اصولوں کا ایسا پابند ہو چکا ہو کہ ان کی خاطر انسانیت دوستی کے عام تقاضوں کو ٹھوکر مار دے۔ ظاہر ہے "کہ ایسی اصول پرستی قابل تعریف نہیں " قابل نفرت ہوگی ۔ کہ ذریعہ تو مقصد کی جگہ قضا لے اور مقصد نگاہ سے اوجھل ہو جائے ۔

ترجمے میں مصنف کے الفاظ کو دوسری زبان میں منتقل کرنا دراصل ذریعہ ہے ۔ مقصد نہیں ہے مقصد تو مفہوم اور خیال کی ادائیگی ہے ۔ اگر الفاظ کو دوسری زبان میں منتقل کرنے سے وہ مفہوم پوری طرح ادا نہیں ہوتا یا اسی قوت کے ساتھ ادا نہیں ہوتا تو کثر لوگوں کے ہر ایک الزام کو سہہ کر الفاظ ، ان کی تقدیم و تاخیر ان کے جوڑ اور جملوں کی ساخت کو بدل کر یہ مقصد پورا کرنا ہوگا یہی ترجمے کا مقصود ہے اور اسی مقصود کو پورا کرنا دیانت داری ہے ۔

مثال کے طور پر کارل مارکس کی تصنیف **Doscapital** جب جرمن زبان میں تیار ہوئی تو اس کے چند سال بعد فرانسیسی جرمن اور انگریزی زبانوں کے ماہر اور معاشیات کے فاضل مسٹر **J. Ray** نے اسے فرانسیسی زبان میں ترجمہ کیا جب یہ فرینچ ترجمہ مکمل ہو چکا تو مارکس نے اس پر نظر ڈالی یہاں مارکس اس مترجم کے متعلق لکھتا ہے۔"اس نے خوب جی لگا کر احتیاط کے ساتھ اپنے فرض کو پورا کیا ۔ لیکن اس نے احتیاط اور توجہ میں اتنی شدت برتی کہ جو ترجمہ ہوا وہ حد سے زیادہ لفظ بہ لفظ ہو گیا ۔ حد سے زیادہ لفظ بہ لفظ **too literal** ہونے کا نتیجہ یہ ہوا کہ مارکس نے اس پر نظر ثانی کی اور خود اپنی تصنیف کے ترجمے میں جگہ جگہ کاٹ چھانٹ کر دی ۔

آخری بات

ترجمہ کرنے والے کو لازمی طور سے اصل عبارت کے الفاظ ہی نہیں بلکہ اس کے بین السطور کو بھی پڑھنا چاہیے اور بین السطور (جو مفہوم ان الفاظ کے درمیان پوشیدہ ہوتا ہے) اس کی مدد سے اصل عبارت کا ترجمہ کرنا چاہیے ۔

ہو سکتا ہے کہ ترجمہ کرنے والے کا اپنا بھی ایک طرز بیان ہو ۔ ممکن ہے اور "اوری جنل" **Original** مضامین لکھنے کے سلسلے میں وہ اپنا ایک طرز ادا بنا چکا ہو اور وہ طرز ادا کافی پختہ ہو چکا ہو ۔ ایسی صورت میں جب وہ ترجمہ کرنے بیٹھے گا ۔ اور اصل عبارت کے بین السطور پر بھی

نظر رکھے گا تو ممکن ہے کہ وہ مصنف کے منشا کی تو پابندی کرتا چلے لیکن اپنے طرز بیان میں بھی اسے لکھ جائے یا مترجم کے طرز ادا کی چھاپ اس پر پڑتی چلی جائے ۔ یہ ترجمے کا وہ عیب ہوگا ۔ جس کا کوئی سدھار نہیں ہے اس سے نقصان یہ ہوگا کہ ترجمے پر اصل مصنف سے زیادہ مترجم چھا جائے گا ۔ اور اصلی مصنف کا طرز بیان۔ جو ترجمے میں جوں کا توں منتقل ہونا چاہیے گم ہو جائے گا ۔ یہ کمزوری ترجمے کا آدھا مقصد اور پورا وصف مٹی میں ملا دیتی ہے اور اس سے خصوصیت کے ساتھ ہوشیار رہنا چاہیے ۔

ترجمہ کی تین راہیں ہیں ۔ ایک لفظی ترجمہ ۔ دوسرا آزاد ترجمہ اور تیسرا ان دونوں کے درمیان کا ترجمہ ۔ اس تیسرے یا اعتدال کے ترجمے کو ہم تخلیقی ترجمہ بھی کہہ سکتے ہیں کیوں کہ جب اس کی تمام شرائط پوری ہوتی ہیں تو وہ صرف تقلید یا نقل نہیں رہ جاتا بلکہ اس میں ایک فنی حسن پیدا ہو جاتا ہے ۔ وہ اصل کو پوری طرح ہضم کرکے اسے نئے وجود اور نئی زیب و زینت سے آراستہ کرنے کے برابر ہے اور اس طرح بجائے خود تخلیق کی حیثیت اختیار کر لیتا ہے ۔

خیال اور مفہوم کو اس کے باریک سے باریک پیچ و خم کے ساتھ ادا کرنے کے لیے ترجمہ کرنے والے کو مصنف کے ساتھ اس طرح چلنا چاہیے جیسے سوشلسٹ انقلاب کی راہ میں محنت کشوں کو انقلابی پارٹی کے ساتھ چلنا ہوتا ہے کہ قدم سے قدم بھی ملائے رہیں ۔ اور آگے نکل جانے یا پیچھے چھٹ جانے کا بھی امکان نہ رہے ۔

اور ترجمہ کی ذمہ داری کے سلسلے میں سو باتوں کی ایک بات یہ ہے کہ ترجمہ کرنے والا اپنے وجود اپنے خیال اپنے جذبے اور اپنے قلم کو اصل مصنف کے سپرد کر دے اور یہ سوچ لے کہ اگر فلاں بات فلاں جملہ تصنیف ، عبارت یا شعر مصنف یا شاعر کو ہماری اس زبان میں لکھنا ہوتا تو وہ کس طرح لکھتا جس طرح اصل مصنف اپنی دوسری زبان میں اسے لکھتا ، ترجمے میں بالکل ویسے ہی لکھ دینا چاہیے ۔

اگر ترجمہ اس حیثیت سے کامیاب ہے تو ہر حیثیت سے کامیاب ہے ۔
اور لفظ بہ لفظ نہ ہونے کے باوجود ہر اعتبار سے مکمل ہے ۔

ترجمہ کے چند پہلو[1]

سید ہاشمی فرید آبادی

کسی نئی تصنیف یا جامع تالیف کا علمی رتبہ ترجمے پر فائق ہے لیکن یاد رکھنا چاہیے کہ اچھا مترجم ہونے کی ایک شرط یہ ہے کہ اچھا انشاء پرداز بھی ہو بجائے کہ انشاء پرداز کے لیے ضروری نہیں کہ دوسری زبان سے عمدہ واقفیت رکھتا ہو۔

انشا پردازی کے سلسلے میں خیال آیا کہ بعض اعلیٰ درجے کے مترجم ترجمے میں اپنا اسلوب نگارش پیدا کر دیتے ہیں۔ اس کی بہت اچھی مثال مولانا ظفر علی خاں کے تراجم ہیں کہ ہیگرڈ کے مترجمہ ناولوں میں بھی ان کی عبارت آرائی کا وہی رنگ جھلکتا ہے جو ''معرکۂ مذہب و سائنس'' میں نظر آتا ہے۔ لیکن عام طور پر مترجم کو اصل مصنف کی طرز تحریر کا اثر قبول کرنا پڑتا ہے۔ زیادہ مشکل اس وقت پیش آتی ہے جبکہ اصل عبارت (خصوصاً انگریزی) شاعرانہ یا خاص ادیبانہ رنگ میں لکھی گئی ہو۔ کسی دوسری زبان کے صنائع، تلمیحات، نازک استعارے اپنی زبان میں اسی حسن و خوبی سے ادا کر دینا خود مترجم کی انشا پردازی کا کمال سمجھنا چاہیے جو حضرات اپنی زبان میں رنگین عبارت آرائی کی مشق و مہارت نہیں رکھتے، ان کے لیے سلامتی کی راہ یہی ہے کہ ان موقعوں پر صاف اور سادہ زبان میں ادائے مطلب پر قناعت کریں۔

ایسے مرحلوں میں دونوں زبانوں کی قوت بیان، فصاحت اور معنویت کا بھی توازن واضح ہو جاتا ہے۔ ہمیں زیادہ تر انگریزی سے سابقہ پڑتا ہے اس کے متقدم انشاپرداز کار لائل اور رسکن سے قطع نظر زمانۂ قریب کے

---

(۱) ترجمہ کے چند پہلو (مذاکرہ) سید ہاشمی فرید آبادی، عبدالمجید سالک، ممتاز حسین مطبوعہ ماہ نو کراچی مارچ ۵۲ء ص ۳۵-۴۳۔

کسی مورلے یا چرچل ہی کی کتاب کا ایک ورق ترجمہ کیجیے تو عام طور پر اردو تحریر ذرا ہلکی معلوم ہوگی۔ مگر اس میں زبان کا اتنا قصور نہیں جتنا اہل زبان کے ذہنی اور تعلیمی معیار کی پستی کو دخل ہے۔ گزشتہ پچاس برس میں اردو نے حیرت انگیز ترقی کی اور ہزاروں کتابیں تالیف و ترجمہ ہو کر ملک میں شائع ہوئیں۔ ان میں ہر صنف اور ہر درجے کی مطبوعات مل جائیں گی لیکن چونکہ عام اور اعلیٰ تعلیم یورپ کے مقابلے میں بہت ہی کم ہے اس لیے ادبی پیداوار میں وہ معنوی گہرائی نہیں پائی جاتی۔ بارہ تیرہ سال کا ذکر ہے خالدہ خانم ادیب کی انگریزی کتاب ''ان سائڈ ان ڈیا'' چھپی تو سر اکبر حیدری مرحوم نے جناب مولوی عبدالحق صاحب سے فرمائش بلکہ تاکید کی کہ بہت جلد اس کا اردو ترجمہ تیار کرا دیا جائے۔ فرمائش کی تعمیل ہوئی۔ ترجمہ چھپ گیا اور اہل نظر نے پسند بھی کیا لیکن جیسا کہ مترجم نے دیباچے میں اشارہ کر دیا ہے۔ اس طرز عبارت کو قبول عام پانے کے لیے غالباً ایک مدت درکار ہوگی۔ اصل یہ ہے کہ فاضلہ مصنفہ بہت گہری اور کارگر تنقید کرتی ہے مگر اس پر باریک ریشم کے ایسے پردے اُڑھا دیتی ہیں کہ علم و ذہانت کی عینک کے بغیر تہ کی بات نظر نہیں آتی اور جس شخص پر تنقید ہوتی ہے وہ چوٹ کھا کر بھی مسکراتا ہے۔

اردو ترجمے میں ابتری اور اس کی بدولت خود زبان کی فصاحت میں خرابی کا ایک سبب اردو روز نامے ہوئے، جن میں زیادہ تر انگریزی سے اطلاعات اور تار کی خبریں بہت جلدی میں ترجمہ کی جاتی ہیں۔ ان کی زبان (اور طباعت بھی) سخت اصلاح کی محتاج ہے، صاف اور بامحاورہ زبان میں ترجمہ کرنے والے مشاق مترجم بھی تعداد میں کم اور مہنگے ہیں۔ اردو انشا پردازی کی طرح ترجمے میں ہمارے رسائل نے ضرور ترقی کی ہے۔

انگریزی سے سلیس اردو میں ترجمہ کرنے کا ایک یہ گر مترجم کو سیکھنا لازم ہے کہ جو، جس، جن، سے فقرے کو پیچیدہ نہ بنائے۔ ان کی انگریزی میں بڑی کثرت ہوتی ہے۔ ہماری زبان میں عطف و ربط کی

دوسری تدبیریں کام میں لائی جاتی ہیں ۔ بیان کے متین و شگفتہ اور متعدد پیرائے اردو میں موجود ہیں ۔ سوائے فنی اصطلاحات کے بالغ اور پر معنی الفاظ کا ذخیرہ بھی کچھ کم نہیں ہے ۔ البتہ انہیں برتنے کے لیے مترجم کی علمی استعداد بلند اور اپنے معیاری ادب سے اسے خوب واقفیت ہونی چاہیے ۔

عبدالمجید سالک

کسی علمی مضمون یا کتاب کا ترجمہ وہی کر سکتا ہے جسے اس کے موضوع سے شغف ہو ۔ مثلاً کسی ادیب یا شاعر کو فلسفے کی کسی کتاب کا ترجمہ کرنے کی کوشش نہ کرنی چاہیے ۔ نہ اقتصادیات کے کسی طالب علم کو طبیعیات کا ترجمہ کرنا چاہیے ۔ کیونکہ ترجمہ "سمجھ لینے اور سمجھا دینے" کا نام ہے ۔ جو شخص کسی متن کو خود نہیں سمجھتا ، وہ کسی کو سمجھانے میں کب کامیاب ہو سکتا ہے ۔ اس کے علاوہ مترجم کے لیے دونوں زبانوں سے خاصی واقفیت ضروری ہے ۔ نہ صرف لفظی واقفیت بلکہ انشائی استعداد ضروری ہے ۔ ورنہ اصل کی روح ترجمے میں کبھی منتقل نہ ہو سکے گی ۔ علمی تراجم میں سب سے بڑی مشکل مصطلحات سے متعلق ہے ۔ جب تک علم کی اس شاخ سے جس سے کتاب متعلق ہے ، اصطلاحاتی شناسائی نہ ہو ، صحیح ترجمہ ممکن ہی نہیں ۔ ایسے دماغ شاذ و نادر ہوتے ہیں ۔ جو اگرچہ دونوں زبانوں میں سے کسی ایک سے زیادہ شغف رکھتے ہیں اور دوسری سے کم ، لیکن اس کے باوجود اعلی درجے کا ترجمہ کر لیتے ہیں ۔ ڈپٹی نذیر احمد مرحوم سے کسی نے پوچھا ۔ آپ انگریزی میں تو محض شدبد ہی رکھتے ہیں ۔ پھر آپ نے تعزیرات ہند کا اتنا اچھا ترجمہ کیونکر کر لیا ۔ انہوں نے جواب دیا کہ بلاشبہ انگریزی میں میری استعداد انٹرنس کے معیار سے زیادہ نہ تھی ۔ لیکن اردو ، فارسی اور عربی کی قابلیت کے باعث میں موزوں الفاظ و مصطلحات نہایت آسانی سے تجویز کر دیتا تھا ۔ لیکن ہر شخص ڈپٹی نذیر احمد نہیں ہو سکتا ۔ جب تک دونوں زبانوں سے یکساں واقفیت نہ ہو کوئی شخص اچھا ترجمہ نہیں کر سکتا ۔

"ادبی ترجمے" چونکہ ان کتابوں ، افسانوں یا ادب پاروں کے ہوتے ہیں ۔ جن کے لکھنے والے زبان و ادب کے فنکار مانے جاتے ہیں اس لیے ان کا مترجم بھی فن کار ہونا چاہیے ۔ یونہی اٹھا کر سیدھے سبھاؤ ادبی شہ پاروں کا ترجمہ کر دینا اس فن لطیف پر ظلم ہوگا ۔ میں جب کبھی ڈاکٹر ٹیگور کی بعض چیزوں کا ترجمہ کیا کرتا تھا تو مجھے ایک ایک لفظ کے ترجمے پر خاص طور سے غور کرنا پڑتا تھا ۔ اگرچہ ساری کتاب میں ایک بھی ایسا لفظ نہ ہوتا جس کے معنی مجھے معلوم نہ ہوتے ۔ لیکن اس کے باوجود میں ہر ضروری لفظ کے لیے ڈکشنری دیکھتا جس میں اس لفظ کے چھ سات معنی لکھے ہوتے ۔ اب میں متن کی روح کے مطابق کوئی ایک لفظ چن لیتا اور فقرے میں نگینے کی طرح جڑ دیتا اور بعض اوقات تو الفاظ اور اجزائے جملہ کے ایسے ترجمے ہو جاتے ۔ جو نہ صرف اصل کا ہو بہو چربا ہوتے ، بلکہ اس میں بھی خاص رونق اور آرائش پیدا کر دیتے ۔ مثلاً :

Patter of Rainfall on the dry Leaves

کا ترجمہ ہوا ۔ "سوکھے پتوں پر بارش پڑاپڑ" **Patter** میں تو ٹیگور نے صرف صوتی اعتبار مدنظر رکھا تھا ۔ میں نے صوتی اعتبار کو بھی ترجمے میں محفوظ رکھا اور لفظی رعایت سے "پڑنے" کا مفہوم بھی شامل کر دیا ۔ ایک فقرہ تھا :

I am the god who was Born of the Mind of the Creator.

میں ترجمہ کیا ۔ "میں وہ دیوتا ہوں جو کرتار کے من سے پیدا ہو" ۔ ایک تو **Mind** کا ترجمہ "من" سے بہتر نہ ہو سکتا تھا ۔ اور پھر **Creator** کا مفہوم دل ، دماغ ، ذہن سے ادا نہ ہو سکتا تھا ۔ اس کے لیے "کرتار" ہی موزوں تھا ۔ خصوصاً ایک ایسے ادب پارے کے ترجمے میں جو ہندو علم الاصنام کی بعض ہستیوں کے متعلق لکھا گیا ہو ۔ اور جس کا ترجمہ لازماً ہندی آمیز ہونا چاہیے تھا ۔ ورنہ اس کی روح غائب ہو جاتی ۔

طوالت کا خوف نہ ہوتا تو میں بیسیوں مثالیں دے دیتا ۔ میرا مقصود یہ عرض کرنا ہے کہ ادبی چیزوں کا ترجمہ کرنے میں انتہائی احتیاط اور پابندی ملحوظ رکھنی چاہیے تاکہ اصل فن کار کی تخلیق کی کوئی صوری یا معنوی خصوصیت مسخ نہ ہونے پائے ۔ اصل کے الفاظ کی پیروی اس کے فقروں کے بانکپن کی حفاظت اور اس کے بیان کی روح ، غرض ہر چیز ترجمے میں منعکس ہونی چاہیے ۔

اخباری ترجمے میں سب سے مقدم مصلحت یہ ہے کہ مطلب بالکل واضح اور عبارت قطعی طور پر سلیس ہو جائے تاکہ عام پڑھنے والوں کو کوئی الجھن نہ ہو ۔ اس کے لیے اپنی زبان کا محاورہ سب سے بہتر رہنما اور معاون ہے ۔ ایک انگریزی اخبار میں یہ فقرہ نظر پڑا ۔

He was conveyed to his place of residence in an intoxicated condition.

اگرچہ انگریزی زبان کے اعتبار سے بھی یہ فقرہ لغو تھا ۔ اور اصل میں یوں ہونا چاہیے تھا He was carried home drunk ۔ لیکن ایک مبتدی مترجم نے اس کا ترجمہ یوں کیا ۔

"وہ بحالت مخموری اپنے مقام سکونت کو لے جایا گیا ۔"

اب آپ انصاف فرمائیے ۔ کیا ترجمہ اس کو کہتے ہیں ؟ کیا یہ اردو ہے ؟ کیا ذیل کا فقرہ بالکل صحیح مفہوم ادا نہ کر سکتا تھا :-

"وہ نشے میں تھا ۔ اسے گھر لے گئے"

ایک مترجم صاحب نے جو اپنی عربی فارسی کی قابلیت کا اظہار کرنا چاہتے تھے ۔ انگریزی کے اس فقرے کا کہ :-

There was an explosion in a coal mine resulting in the death of five persons.

یوں ترجمہ کیا کہ "ایک معدن زغال میں دھماکا ہوا۔ نتیجے کے طور پر پانچ نفوس کی ہلاکت وقوع پذیر ہوئی"۔ میں نے مترجم صاحب کو جا کر کہا کہ اس فقرے پر آپ کو کیا اعتراض ہے ۔ کہ "کوئلے کی ایک کان پھوٹ گئی ۔ پانچ آدمی مر گئے" ۔ کیا آپ کے نزدیک یہ غلط اردو ہے

اصل خبر کا یہ ترجمہ غلط ہے ؟ بیچارے اپنا سا منہ لے کر رہ گئے ۔ میں نے کہا ایک تو "نتیجے کے طور پر" نہایت بیہودہ جزو جملہ ہے ۔ اس کو عمر بھر نہ لکھیے گا ۔ دوسرے ، کسی آدمی کی "ہلاکت وقوع پذیر نہیں ہوا کرتی" ۔ وہ صرف مر جاتا ہے ۔ اور یہی کہنا چاہیے ۔

ایک فقرہ تھا ۔

Adverse climatic conditions prevented the progressive writers from holding their meeting.

ترجمہ کیا گیا کہ ۔

"مخالف موسمی حالات نے ترقی پسند ادیبوں کو جلسہ منعقد کرنے سے روک دیا" ۔

حالانکہ سیدھا سادہ ترجمہ یوں ہونا چاہیے تھا کہ ۔

موسم خراب تھا اس لیے ترقی پسند ادیبوں کا جلسہ نہیں ہو سکا"
یا "موسم کی خرابی کی وجہ سے ترقی پسند ادیب اپنا جلسہ منعقد نہیں کر سکے" ۔

میرا مطلب یہ ہے کہ اگر اخباری مترجم سادگی ، سلاست اور محاورہ اردو کو مدنظر رکھ کر ترجمہ کریں تو خود بھی آرام سے رہیں اور پڑھنے والوں کے ذہن بھی نہ الجھیں ۔ ان کو چاہیے کہ جہاں انگریزی فقرے کی ترکیب پیچیدہ اور طویل پائیں ، وہاں اس کی چیر پھاڑ کر دیں ۔ Complex فقرے کو چند Simple فقروں میں تقسیم کر دیں ۔ اور ترجمہ کرنے کے بعد ایک دفعہ پڑھ کر دیکھ لیں کہ آیا اصل کا مطلب ادا ہوگیا ۔ اگر ہر پہلو سے مطلب ادا ہوگیا تو سبحان اللہ ۔ ورنہ ادھر اُدھر کمی بیشی کرکے اس کو پورا کر دیں۔ ڈکشنری مترجم کا سب سے بڑا ہتھیار ہے ۔ اس کو ہر وقت حرزجان بنا کر رکھنا چاہیے اور کبھی اس غلط فہمی میں نہ رہنا چاہیے کہ ہم بڑے انگریزی اور بڑے اردو خواں ہیں ۔ کیونکہ ممکن ہے ۔ وقت پر کسی لفظ کا صحیح اور موزوں ترجمہ نہ سوجھے اور ڈکشنری دیکھنے سے کوئی ایسا نفیس لفظ ہاتھ آ جائے جو فقرے میں جان ڈال دے ۔

ممتاز حسین

ترجمے کا میدان بہت ہی وسیع ہے ۔ فلسفے اور مضامین سے لیکر شعر و ادب کے نازک ترین اصناف سخن تک کا ترجمہ ایک زبان سے دوسری زبان میں کیا جا سکتا ہے لیکن ان میں سے ہر ایک کی ہیئت دوسرے سے مختلف ہوگی ۔ بظاہر ترجمے کی دو ہی صورتیں ہو سکتی ہیں ۔ ایک ایسے افکار و خیالات کا ترجمہ جن کے اظہار میں احساسات کو التزاماً ذریعہ نہ بنایا گیا ہو بلکہ حتی الوسع احساسات سے آزاد ہو کر خیالات کی ترجمانی کی گئی اور زبان کی تمام صلاحیتیں ، منطق و استدلال میں اس پر صرف کی گئی ہوں نہ کہ حسیہ تصویروں کے ذریعہ خیالات و جذبات کے مرکبات کو ابھارنے اور احساسات کے ذریعے خیالات کو پہونچانے میں ۔ فلسفہ اور سائنس وغیرہ اسی زمرے میں آتے ہیں ۔

دوسری صورت ایسے افکار و خیالات کا ترجمہ ہے جن کا اظہار التزاماً احساسات کے ذریعے کیا گیا ہو اور زبان کی دولت مجرد تصورات کی ترسیل اور منطق و استدلال پر نہیں بلکہ تجربات کی مصوری اور خیالات کو محسوس کرانے کی کوشش میں صرف کی گئی ہو ۔ شعر و ادب کی صنفیں اس زمرے میں آتی ہیں ۔

ترجمے کے یہ دونوں میدان ایک دوسرے سے اسی طرح مختلف ہیں جس طرح فلسفہ اور شعر ، گو یہ صحیح ہے کہ ان کی سرحدیں آپس میں ٹکراتی بھی ہیں لیکن یہ سنگم ایسا نہیں کہ آپ ان کی علیحدہ حیثیتوں کو محسوس نہ کر سکیں ۔ جب تک ہم ترجمہ کرتے وقت اس امتیاز کو اپنے سامنے نہ رکھیں گے کامیاب مترجم نہیں بن سکتے ۔ ضرورت یہ ہے کہ ہم اپنی زبان کی ساخت اور صلاحیت کو بھی سمجھیں ۔ کسی زبان میں دوسری زبان کا علم و ادب اسی وقت منتقل ہو سکتا ہے جبکہ اس میں مطلوبہ خیالات کے اظہار کی صلاحیت ہو ۔ اردو کی ایک علیحدہ ساخت ہے جو دوسری زبانوں کی ساخت سے مختلف ہے ۔ ترجمہ کرتے وقت لامحالہ اس بات کو ملحوظ رکھنا پڑے گا ۔

یوں تو تاریخ اور تمدن کی بہت سی کتابوں کا ترجمہ اردو زبان میں ہوا ہے لیکن جو صحت خیال ، شگفتگی بیان اور سلاست و روانی سید علی بلگرامی کی کتاب "تمدن عرب" میں ہے وہ مشکل ہی سے اس قبیل کی دوسری کتابوں میں ہوگی ۔ حال ہی میں کانٹ کی کتاب (Critique of Pure Reason) کا ترجمہ اردو میں پیش کیا گیا ہے ۔ اس میں شبہ نہیں کہ مترجم کی نظر فلسفے کے مطالعے میں کافی عمیق ہے اور انہوں نے کتاب کا براہ راست جرمن زبان سے ترجمہ بھی کیا ہے لیکن اردو ترجمہ بہ نسبت انگریزی ترجمے کے زیادہ ٹھس ہے ۔ ممکن ہے اردو فلسفیانہ حقائق کے اظہار کرنے سے معذور ہو یا کانٹ کا فلسفہ بذات خود بہت پیچیدہ ہو لیکن مترجم اس الزام سے سبکدوش نہیں ہو سکتا کہ اس نے کانٹ کی کتاب کو ہمارے لیے کسی طرح آسان نہیں بنایا ۔

اس کتاب کے مقابلے میں ایک دوسری کتاب "بقول زرتشت" لیجیے ، یہ نتشے کی کتاب "یوں زرتشت نے کہا" کا ترجمہ ہے ۔ اس میں شبہ نہیں کہ نہ تو نتشے کے فلسفے میں وہ فلسفیانہ عمق، موشگافیاں اور پیچیدگیاں ہیں جو کانٹ کے فلسفے میں ہیں اور نہ اس تصنیف کو خالصتاً فلسفیانہ کہا جا سکتا ہے ۔ کیونکہ اس میں روایتی فلسفے کی بجائے وجدانی فلسفہ پیش کیا گیا ہے جس میں فلسفے سے زیادہ شاعری کا مزا ہے ، پھر بھی اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ یہ ایک فلسفیانہ کتاب ہے ۔ غالباً اس کا ترجمہ بھی براہ راست جرمن زبان سے کیا گیا ہے پھر بھی جو لوگ جرمن زبان سے واقف نہیں اور اردو کے علاوہ صرف انگریزی زبان ہی جانتے ہیں ۔ اسے انگریزی کے بجائے اردو ہی میں پڑھنا پسند کرتے ہیں ۔ اسلوب بیان بہت شاعرانہ ہے جس سے مصنف کی شخصیت اجاگر ہوتی ہے ۔ ویسے بھی اصل عبارت میں غالباً کوئی تصرف نہیں کیا گیا ۔ علمی تراجم میں تو صحت خیال کے ساتھ قوت استدلال کا اظہار لازمی ہے لیکن ادبی تراجم میں ان کے بجائے ان احساسات کا اظہار زیادہ اہم ہے جن کے ذریعہ خیالات ادا کیے گئے ہیں ۔ گو قوت استدلال کا اظہار یہاں بھی درکار ہوتا ہے لیکن اس کی اپیل مختلف ہوتی ہے ۔ یہ صرف دماغ ہی کو اپیل نہیں کرتی بلکہ انسان

کے تمام قوائے احساس کو اپیل کرتی ہے جن میں احساس جمال، احساس صورت اور صوت و نغمہ بھی شامل ہیں ۔ اسی لیے شاعری میں جو ادب کی ایک مخصوص صنف ہے الفاظ کی اہمیت صرف معنوی نہیں بلکہ صوتی بھی ہوتی ہے ۔ اس میں اظہار خیال ہمیشہ احساس کے ذریعے ہوتا ہے ۔ اس لیے ایک زبان کے شعر کو دوسری زبان میں منتقل کرنا اگر ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے ۔ شعر کا ترجمہ صرف ایک شاعر ہی کر سکتا ہے وہ بھی اس وقت جب کہ وہ اصل خیال کو اپنے احساسات سے گزارے اور یہ طریقہ کار تقریباً نیم تخلیقی ہو جاتا ہے کیونکہ احساسات داخلی ہوتے ہیں ۔ اور تمام وسعتوں اور گہرائیوں کے ساتھ دوسرے کے جسد میں منتقل نہیں ہو سکتے ۔ دوسروں کے احساسات پر اتنا قابو حاصل نہیں کیا جا سکتا جتنا ان کے خیالات پر اس حسن و خوبی کے ساتھ فارسی کے بہت سے اشعار کا ترجمہ اردو میں ہوا ہے ۔ یہ خوبی انگریزی نظموں کے تراجم میں بہت کم نظر آتی ہے ۔ شاید اس لیے کہ انگریزی کے برعکس اردو اور فارسی میں نہ صرف بہت سے الفاظ بلکہ بحریں بھی مشترک ہیں ۔ اگر اردو اس دشواری کو ایک عذر بنا لے تو وہ بجز فارسی کے اور کسی زبان کی شاعری کا ترجمہ کرنے سے قاصر رہے گی ۔ اس لیے میں کچھ ایسی مثالیں پیش کروں گا جہاں یہ مشکل سد راہ نہیں رہی اور نہایت خوبی کے ساتھ انگریزی نظم اردو زبان میں منتقل ہوئی ہے ۔ ان میں ایک طباطبائی کی "شام غریباں" ہے جو ولیم گرے کے مرثیے (Elegy in a Churchyard) کا ترجمہ ہے ۔ اس کی خوبی یہ ہے کہ شاعر کے خیالات میں کہیں بھی تصرف نہیں کیا گیا اور انہیں کم و بیش ان تمام تاثرات اور احساسات کی گہرائیوں کے ساتھ پیش کیا گیا ہے جو اصل نظم میں ملتی ہیں ۔ طباطبائی نے یہ کام کسی محیر العقول ذہنی صفائی سے نہیں بلکہ مناسب بحر کی تلاش اور ردیف وقافیے کے انتخاب سے انجام دیا ہے ۔ عنایت اللہ مرحوم نے شیکسپیر کے متعدد ڈراموں کے ترجمے کیے لیکن اس بات پر غور کیے بغیر کہ یہ ڈرامے نظم میں ہیں ۔ اس لیے شیکسپیر کی روح تو درکنار وہ "چوڑی پیشانی والا" شیکسپیر بھی ان ترجموں میں نہیں ہے جو تصویروں میں نظر آ جاتا ہے ۔

یہی خامی "فاؤسٹ" کے واحد اردو ترجمے میں نظر آتی ہے ۔ شعر کا ترجمہ شعر ہی میں ہو سکتا ہے ۔ ممکن ہے بعض لوگ کہیں کہ "واہ صاحب! شیکسپیر کے ڈراموں کا ترجمہ نثر میں کیوں نہیں ہو سکتا؟" اس کا جواب یہ ہے کہ شیکسپیر کے ڈراموں کا حسن متنازعہ فیہ مسائل کے حل میں نہیں بلکہ عقل و جذبات، انسانیت اور سوداگری کی اس تہ در تہ رقابت اور تصادم میں ہے جس کا شعور صرف کنار ذہن نہیں بلکہ دل کی گہرائیوں میں ہوتا ہے ۔ اس شعور کی ترجمانی عنایت اللہ کے کسی ڈرامے میں نہیں اس کے لیے شاعرانہ نثر درکار ہے جو ان کے یہاں مفقود ہے ۔ افسوس ہے کہ اردو کی شعری زبان کافی گرانمایہ ہونے کے باوجود اس میں مغربی نظموں اور ڈراموں کے ترجمے اچھے نہیں ہوئے ۔ اس کام کی طرف وہ لوگ متوجہ ہوتے ہیں جنھیں شعری زبان پر خاطر خواہ دسترس نہیں ہوتی ۔ حال ہی میں رلکے کے چند مرثیوں کا ترجمہ کیا گیا ہے ان میں شاعری تو ایک طرف رہی خیال محض بھی صحت کے ساتھ منتقل نہیں ہو سکا ۔ اگر علامہ اقبال کی ان نظموں کو سامنے رکھا جائے جن کو انھوں نے انگریزی زبان سے منتقل کیا ہے تو یہ بات کسی حد تک واضح ہو جاتی ہے کہ شعر کا ترجمہ صحیح معنوں میں ایک شاعر ہی کر سکتا ہے ۔ یہ نظمیں سب کی سب اعلیٰ معیار پر پوری اترتی ہیں اور بعض تو اتنی مقبول ہو چکی ہیں کہ ان پر ترجمہ ہونے کا شبہ ہی نہیں گزرتا ۔ ایمرسن کی ایک نظم کا منظوم ترجمہ جسے علامہ اقبال نے "رخصت اے بزم جہاں" کے عنوان سے پیش کیا ہے اتنا حسین ہے کہ اسے مثال کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے ۔ اس ترجمے کی خوبی یہی ہے کہ مترجم نے نہ صرف شاعر کے خیالات بلکہ احساسات کو بھی پیش کیا ہے اور اس کے لیے نہ صرف مناسب بحر تلاش کی ہے بلکہ حسب ضرورت انگریزی کی تلمیحات اور استعاروں کو اردو کی تلمیحات اور استعاروں میں بدل دیا ہے ۔ نظم میں ترجمے کی دیانتداری کا یہی مفہوم ہے ۔ خیالات کے ساتھ صحیح احساسات کو بھی منتقل کرنا نہ کہ لفظی ترجمہ کرنا اور ایسے غیر مانوس الفاظ کو دیانتداری کے ماتحت جگہ دینا جن سے احساسات کی ترسیل بالکل ختم ہو

جائے لیکن یہ سمجھنا کہ اس کام کا نباہ صرف علامہ اقبال جیسے بڑے شاعر ہی سے ہو سکتا ہے ۔ صحیح نہیں ہر وہ شخص یہ کام سر انجام دے سکتا ہے جو مناسب ذوق شعری سے بہرہ ور ہو ۔ جسے الفاظ کے انتخاب پر دسترس ہو اور جس میں یہ صلاحیت ہو کہ وہ دوسروں کے احساسات کو اپنے نفس پر اس طرح وارد کرے کہ انہیں اپنی زبان میں گنگنانے پر مجبور ہو جائے۔ مخدوم محی الدین نے قازقستانی شاعر جابر جمبول کی نظم "استالین" کا بہت عمدہ ترجمہ کیا ہے ۔ اور وہ بھی اصل کے بجائے انگریزی ترجمہ سے پھر بھی یہ اصلی نظم کے حسن سے زیادہ قریب ہے ۔ اس کی خوبی الفاظ اور تراکیب کے مرادفات تلاش کرنے میں نہیں بلکہ نظم کی روح ، جذباتی اور نغماتی اتار چڑھاؤ اور دیگر عناصر کا صحیح عکس پیش کرنے میں ہے ۔ ترجمہ ایک ۔الہٰی فکر ایک نہ ٹوٹنے والے جذباتی گھیرے سے اسی طرح ابھرا ہے جس طرح بیج سے پودا ، یہ حسن اس لیے بھی پیدا ہوا کہ مترجم اصل مصنف کے خیالات اور احساسات میں بدرجۂ اتم شریک ہوگیا ۔

گذشتہ پندرہ بیس سال کے عرصے میں اردو زبان میں بے شمار افسانے لکھے گئے ہیں جن میں سے کچھ درحقیقت ترجمہ ہیں ۔ مترجمہ افسانوں میں خواجہ غلام السیدین کا ایک ترجمہ "آخری سبق" خاص لطف رکھتا ہے یہ موپساں کے ایک افسانے کا ترجمہ ہے ۔ اس ترجمہ میں اردو زبان اصل کے تاثر کو منتقل کرنے میں کہیں حائل نہیں ہوئی بلکہ اس کی قوت کو لفظ بہ لفظ اور سطر بہ سطر ترجمہ کے بجائے ایک مخصوص جذبہ کی ترجمانی پر صرف کیا گیا ہے ۔

ناول کا کینوس اتنا وسیع ہوتا ہے اور صفحات اتنے زیادہ کہ مترجم کے لیے جذبات کو ایک ہی سطح پر اپنے سینے میں تھامے رکھنے کا موقع نہیں ملتا ۔ شاید یہی وجہ ہے کہ ناولوں کے اچھے ترجمے ہماری زبان میں کم ہیں ۔ ایک تو معیاری ناولوں کے ترجمے ہی کم ہوئے اور جو ہوئے بھی ہیں ان میں سے بہت کم معیاری ہیں اختر حسین رائے پوری کے ترجمے "پیاری زمین" میں ایک خاص خوبی ہے ۔ مترجم نے پرل بک کے خیالات

اور احساسات کو اپنی زبان میں اس طرح منتقل کیا ہے جیسے وہ خود لکھ رہے ہوں نہ اس طرح جیسے کسی قانونی مسودے یا مقدس کتاب کا ترجمہ کیا جاتا ہے گذشتہ سالوں میں "اور ڈان بہتا رہا" ۔ "ماں" "آزادی کی راہ" "شکسپیئر کے قصے" "آخری سلام" اور "مادام بووری" بھی سامنے آئے ہیں ۔ ان میں سید مطلبی ، سردار جعفری اور حسن عسکری کے ترجمے کافی اچھے ہیں سید صاحب کے ترجمے میں روانی اور بہاؤ نہیں ۔ "مادام بووری" کے ابتدائی صفحات بہت ناقص ہیں ۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے انگریزی یا فرانسیسی صرف ونحو کو بدلنے کی کوشش نہیں کی گئی ۔

rekhta

گر ترجمے سے فائدہ اخفائے حال ہے[1]

ایزرا پاؤنڈ نے کہا ہے کہ جو دور تخلیقی ادب کے لحاظ سے عظیم ہوتا ہے وہ ترجموں کے لحاظ سے بھی عظیم ہوتا ہے یا تخلیق کا دور ترجمے کے دور کے بعد آتا ہے ۔ مثال کے طور پر انگریزی میں ایلزبتھ کا زمانہ ۔ پاؤنڈ کی رائے میں اووڈ کا مترجم گولڈنگ اتنا بڑا شاعر ہے کہ اس کا مقابلہ ملٹن سے کیا جا سکتا ہے پھر انگریزی میں دو ایک ترجمے ایسے ہوئے ہیں جو بعض اعتبار سے اصل کتاب سے بھی بڑھ گئے ہیں ۔ مثلاً سترھویں صدی میں رابلے کا ترجمہ جو سر ٹامس ارکرٹ نے کیا تھا ۔ یا ہمارے زمانہ میں پروست کا ترجمہ جو اسکاٹ مولکریف نے کیا ہے اور خود مصنف کی رائے میں اصل سے بہتر ہے ۔

ترجموں کے متعلق پاؤنڈ کی رائے کا اطلاق ہمارے ادب پر بھی ہوتا ہے ۔ جب ساری دنیا نے ادب کا ذکر ہو تو اردو ادب کے کسی دور یا کسی شاعر کے متعلق "عظیم" کا لفظ استعمال کرتے ہوئے ہچکچاہٹ ہوتی ہے ۔ بہر حال ہمارے یہاں جس قسم کی بھی عظمت ہو ۔ اس کا کچھ نہ کچھ تعلق ترجموں سے ضرور ہے ، اُردو ادب کے آغاز سے لے کر غالب کے زمانے تک ترجمے چاہے زیادہ نہ ہوئے ہوں لیکن ہمارے شاعر دو قسم کی کوششیں کر رہے تھے ۔ ایک طرف تو وہ فارسی کے اسالیب اور تصورات کو اپنی زبان کے سانچے میں ڈھال رہے تھے دوسری طرف خود

(۱) مشمولہ ستارہ یا بادبان از محمد حسن عسکری شائع کردہ مکتبہ سات رنگ ۔ اکبری منزل پیر الٰہی بخش کالونی کراچی نمبر ۵ ۔ ۱۹۶۱ صفحات ۱۶۶ ۔ ۱۶۹ ۔

اپنی زبان کا ایک مزاج اور ایک روح متعین کرنی چاہتے تھے ۔ یہ بالکل وہی چیز ہے جو تیرھویں اور چودھویں صدی میں اٹلی اور انگلستان کے شاعروں نے فرانسیسی کے زیر اثر اپنی اپنی زبانوں کے لیے کی ۔

پھر جب مغرب کا اثر پڑنا شروع ہوا تو سرشار جیسے ناول نگار نے "ڈان کوئکزٹ" کا ترجمہ کیا ۔ سر والٹیئر کے طفیل اُردو میں کم سے کم دو ناول وجود میں آئے ۔ ایک تو "فسانۂ آزاد" دوسرے "حاجی بغلول" خیر اتنا تو صاف ظاہر ہے کہ سرشار کی تخلیق اور ان کے ترجمے میں بہت گہرا رشتہ ہے ۔ لیکن سوال یہ ہے کہ "خدائی فوجدار" ترجمے کے لحاظ سے کیسا ہے ؟ پہلی بات تو یہ ہے کہ سرشار نے ترجمہ کیا ہی نہیں ۔ بلکہ اصل کہانی کو دیسی لباس پہنایا ہے ۔ اس میں انہیں کھینچ تان بھی کرنی پڑی ہے اور ٹھونس ٹھاس بھی ۔ اس طرح کتاب کے بعض حصے بالکل مہمل ہو کے رہ گئے ہیں۔ پھر انہوں نے سر والٹیئر کو پوری طرح سمجھنے کی کوشش بھی نہیں کی ۔ غالباً انہیں پوری طرح سمجھنے کی ضرورت بھی نہیں تھی ۔ کیونکہ سرشار کے زمانے میں معاشری تبدیلیاں شروع تو ہوگئی تھیں لیکن صدیوں کے عرصے میں اس معاشرے نے جو شکل اختیار کر لی تھی ، وہ کم سے کم ظاہری طور پر باقی تھی اور میرا خیال ہے کہ ایک مربوط معاشرے میں رہنے والا آدمی کسی دوسرے معاشرے کے ادب کو پوری طرح نہیں سمجھ نہیں سکتا ۔ اس کے اعصاب ہی اجنبی تجربات کو قبول نہیں کرتے ۔ دوسروں کے ادب کو پوری طرح سمجھنے کی فکر یا خواہش تو ہم جیسے لوگوں کو ہوتی ہے جو ایک خلا میں رہتے ہوں ۔ مثلاً یورپ ہی نے مشرق کے فلسفوں کو انیسویں صدی میں سمجھنا شروع کیا جب مغربی سماج کی بنیادیں ہلنے لگی تھیں ۔ اس لیے اگر سرشار نے ایک مغربی شاہکار کو ترجمہ یا اخذ کرتے ہوئے بگاڑ کے رکھ دیا تو اس میں ہنسنے کی کوئی بات نہیں ۔ انہوں نے اس کتاب میں اتنا ہی پڑھا جتنا ان کے معاشرے نے پڑھوایا ۔ چلیے ترجمے کے لحاظ سے ایک خرابی تو "خدائی فوجدار" میں یہ ہوئی ۔ اس سے بھی بڑی خرابی اس میں یہ ہے کہ اس کی عبارت ناہموار ہے ۔ چار جملے بے ڈھنگے ، آدھا صفحہ مزے

لے لے کے لکھا ہے تو آدھے صفحے میں گھاس کاٹی ہے ۔ اس پر جتنے بھی اعتراض کیے جا سکتے ہیں وہ مجھے قبول ہیں اور میں اُسے اردو کی بڑی کتابوں میں بھی نہیں شمار کرتا ۔ لیکن میں اس کے متعلق وہی بات کہنے کو تیار ہوں ، جو ایزرا پاؤنڈ نے ہومر کے پوپ والے ترجمے کے بارے میں کہی ہے ۔ لوگ شکایت کرتے ہیں کہ پوپ کے ترجمے میں ہومر وہ نہیں رہا جو اصل یونانی میں ہے ۔ پاؤنڈ کی رائے ہے کہ پوپ نے ہومر کو چاہے کچھ کا کچھ بنا دیا ہو ، لیکن کم سے کم "کچھ تو بنایا ہے" سرشار نے بھی سر والٹیئر کا ترجمہ کرتے ہوئے "کچھ تو بنایا ہے" یہ ایسی بات ہے جو سرشار کے بعد آنے والے ایک مترجم کے بارے میں بھی نہیں کی جا سکتی ۔ کم سے کم یہ ایک ایسی کتاب ہے جس کا نام آپ اردو نثر کی وقیع کتابوں میں سے خارج نہیں کر سکتے ۔ اس میں کچھ بھی نہ سہی اتنا تو ہے کہ اس کا تیس چالیس فیصدی حصہ دلچسپی سے پڑھا جا سکتا ہے ۔ اردو میں مغربی ادب کے جو ترجمے ہوئے ہیں ان کی کیفیت نظر میں رکھیں تو اتنی بات بھی غنیمت معلوم ہوتی ہے ۔

نیاز فتح پوری والے دور میں براہ راست ترجموں کی تعداد چاہے کم ہو لیکن جس قسم کی لجلجی رومانیت اور جمال زدگی ان لوگوں نے پیدا کرنی چاہی وہ بھی اخذ اور ترجمے کرنے والی ذہنیت کا نتیجہ ہے ۔ میں نے ان لوگوں کی تحریریں کبھی لڑکپن میں پڑھی تھیں ۔ اس کے بعد پھر ہمت نہیں پڑی ۔ "کچھ غم دوراں کچھ غم جاناں" ہی کیا کم ہے جو اوپر سے بکری پالی جائے۔ اس لیے مجھے معلوم نہیں کہ ان لوگوں نے کن مغربی ادیبوں سے اثر لیا ، اور کن افسانوں کے ترجمے کیے ۔ ایک آسکروائلڈ کا اثر تو مسلم ہے ۔ کیونکہ ان کی تحریروں میں جا بجا آسکروائلڈ کے خیالات بری طرح ترجمے کیے ہوئے بکھرے پڑے ہیں ۔ دوسرا اثر شاید گیٹے کے "ورتر" کا ہے ۔ بہر حال انہوں نے آسکروائلڈ کی سی چستی پیدا کرنے کے لیے ایک تجربہ یہ ضرور کیا کہ بغیر فعل کے جملے لکھے جائیں۔ ایسے جملوں سے اُردو نثر کو کیا نقصان پہنچا ۔ یہ تو میں پہلے کئی دفعہ بتا چکا ہوں ، لیکن کبھی کبھی دم کٹے جملوں کی ضرورت پیش آتی ہے ۔

خصوصاً اس لیے کہ اردو میں جملہ فعل پر ختم ہوتا ہے اور "تا تھا" "تے تھے" وغیرہ کی تکرار نثر کے آہنگ کو برباد کرکے رکھ دیتی ہے ۔ پھر ذرا جملہ لمبا ہو جائے تو اس میں چار پانچ دفعہ "کا" "کی" "کے" "کہ" آتا ہے ۔ یہ ایک مستقل درد سر ہے ۔ میں تو بعض دفعہ جھنجلا کے یہ کہنے لگتا ہوں کہ ایسی زبان میں اچھی نثر لکھی ہی نہیں جا سکتی ۔ بہر حال مریل جمال پرستوں نے اس مسئلے کا ایک حل ضرور پیش کیا تھا جو کبھی کبھی مفید ثابت ہو سکتا ہے ۔ اور یہ چیز بھی آسکروائلڈ کے خیالات کا ترجمہ کرنے کے سلسلہ میں ہاتھ آئی ۔

۳۶ء کے آس پاس جو ترجمے فرانسیسی اور روسی افسانوں کے ہوئے ان سے اردو نثر نے غیر جذباتی بیان اور ایک ہی جملہ میں کسی چیز کے مختلف اجزا کے نام گنوانے کا طریقہ سیکھا ۔ آج اردو افسانوں میں عام طور پر جو زبان استعمال ہوتی ہے وہ انہیں ترجموں کی بدولت وجود میں آئی ہے ۔ اس زمانے میں ترجمے تو بیسیوں لوگوں نے کیے ۔ لیکن اگر کسی ایک آدمی کو مثال کے طور پر پیش کرنا ہو تو منٹو کا نام لیا جا سکتا ہے آج کل کی افسانوی زبان کے تعین میں منٹو کے ترجموں کو جو دخل ہے اُسے نہیں بھولنا چاہیے ۔ لیکن دوسری طرف یہ بھی حقیقت ہے کہ اس دور کے ترجموں نے ان دو باتوں کے علاوہ ہماری نثر کو اور کچھ بھی نہیں سکھایا ۔ نثر نگاری کے سلسلہ میں روسی افسانے ہمیں کیا سکھاتے ہیں ، اس سوال کا میں کوئی جواب نہیں دے سکتا ۔ کیونکہ میں ایسی کتابیں نہیں پڑھ سکتا جن میں روح کو مادی چیزوں سے الگ کر لیا گیا ہو ۔ لیکن اس ذاتی تعصب سے قطع نظر ویسے بھی مجھے شبہ یہ ہے کہ دوستوئفکی کے ناول پڑھنے سے روح میں تلاطم چاہے جتنا ہو ۔ لیکن آدمی کی نثر خراب ہو جاتی ہے ۔ پھر دوستوئفکی چاہے جتنا بڑا ادیب ہو لیکن عموماً یہی دیکھنے میں آیا ہے کہ جس نے اس سے اثر لیا وہ عمر بھر لڑکا ہی بنا رہا ۔ اردو افسانے پر تو خیر اس کا اثر ہی کتنا ہے ۔ لیکن ہندی کے دو ایک افسانہ نگار میں نے ایسے دیکھے ہیں جنہیں دوستوئفکی نے خراب کیا ۔ ممکن ہے بیدی کے افسانوں کی خرابیاں بھی اسی اثر کا نتیجہ ہوں ۔ بہرحال

مجھے نہیں معلوم کہ روسی افسانے پڑھ کے آدمی معقول نثر لکھنا سیکھ سکتا ہے یا نہیں ۔ لیکن افسوس کی بات یہ ہے کہ ہمارے یہاں موپاساں کے افسانے اتنے پڑھے گئے اور ہم نے اس سے موضوع کے انتخاب کے علاوہ اور کچھ بھی نہیں سیکھا ۔

خیر، اب اپنے زمانے کی طرف آئیے ۔ آج کل ترجموں کی ضرورت شدت سے محسوس کی جا رہی ہے اور کچھ برے بھلے ترجمے ہو بھی رہے ہیں ۔ لیکن ترجموں کا ہونا یا نہ ہونا ایسی اہم بات نہیں ۔ سوچنے کی بات تو یہ ہے کہ ان سے ہمارے تخلیقی ادب پر کیا اثر پڑ سکتا ہے ۔ ابھی تک تو ہمارے یہاں ترجمے اس نقطۂ نظر سے کیے اور پڑھے جاتے ہیں کہ اردو پڑھنے والوں کو بھی اصل کتاب کی کہانی معلوم ہو جائے ۔ ترجموں سے زیادہ سے زیادہ اثر ہم لوگ یہ لیتے ہیں کہ ہمارے ادیب بھی ویسے ہی موضوعات پر لکھنے لگتے ہیں ۔ لیکن ترجمے کی بدولت ہمیں ایسا تخلیقی جذبہ نہیں ملتا جیسا سرشار کو مل گیا تھا، نہ ان کے ذریعے ہماری نثر کے اسالیب میں کوئی اضافہ یا تغیر ہوتا ہے ۔ میں نے خود کوئی ایسا ترجمہ نہیں کیا جس پر میں فخر کر سکوں، لیکن ایزرا پاؤنڈ کی تقلید کرتے ہوئے میں تو اچھا ترجمہ اسی کو سمجھتا ہوں جس میں چاہے اصل کتاب کی روح برقرار نہ رہے لیکن وہ کچھ نہ کچھ بن ضرور جائے ۔ خرابی یہ ہے کہ ترجموں کے معاملے کو ہم نے ابھی تک ادبی مسئلہ نہیں سمجھا ۔ اسی لیے تو ہمارا ادب، خصوصاً ہماری نثر روز بروز مضمحل ہوتی جا رہی ہے ۔

اس مسئلے کی اہمیت ہم نے اب تک اس وجہ سے محسوس نہیں کی کہ ہمیں اپنی زبان کے متعلق خوش فہمیاں بہت زیادہ ہیں ۔ یہ خود اطمینانی غالباً ایک حد تک اردو ہندی کے جھگڑے کا نتیجہ ہے اور کچھ اردو کے نقادوں کا کرشمہ ۔ ہمیں بار بار بتایا جاتا ہے کہ ہماری زبان دنیا کی بڑی زبانوں میں سے ہے اور اردو میں ہر خیال ادا ہو سکتا ہے ۔ خیال وہاں تو میں جانتا نہیں شاید اردو میں کانٹ کا ہر خیال پوری پوری صحت کے ساتھ منتقل ہو جائے لیکن اگر کوئی صاحب پروست کا ایک جملہ

اردو میں ٹھیک ترجمہ کرکے دکھائیں تو میں اردو کو دنیا کی سب سے بڑی زبان مان لوں گا ۔ چلیے اسے بھی چھوڑئیے ۔ آپ کہیں گے کہ اردو میں ابھی اتنے پیچیدہ اور گنجلک جملوں کو سہارنے کی اہلیت نہیں پیدا ہوئی ۔ سیدھے سادے جملوں ہی کا معاملہ لیجیے ۔ یوں کرنے کو تو میں نے "مادام بواری" کا ترجمہ کر دیا ہے ۔ لیکن اس ناول میں ایک ٹکڑا ہے، جس میں ہیروئن کی چھتری پر برف گرنے کا منظر پیش کیا گیا ہے ۔ اگر اردو کے سارے ادیب مل کر ان آٹھ دس سطروں کو اس طرح ترجمہ کر دیں کہ اصل کا حسن ویسا کا ویسا ہی رہے تو اس دن سے میں اردو کے علاوہ کسی اور زبان کی کتاب کو ہاتھ نہیں لگاؤں گا۔ یہ میں اردو زبان کی برائی نہیں کر رہا ہوں ۔ خامیاں تو ہر زبان میں ہوتی ہیں، لیکن ہم لوگ تو یہ سمجھتے ہیں کہ ہماری زبان میں اب کسی ترمیم یا اضافے کی ضرورت ہی نہیں رہی ۔ ادیب کو اپنی زبان سے محبت اور اس پر یقین تو ضرور ہونا چاہیے لیکن تخلیقی کام کرنے والوں کو اس بات سے کوئی مطلب نہیں ہونا چاہیے کہ ہماری زبان کا شمار دنیا کی بڑی زبانوں میں ہوتا ہے یا نہیں ۔ ہماری زبان اچھی ہو یا بری ۔ ہمارے لیے تو یہ پیر تسمہ پا کی طرح ہے ۔ ہم اس سے پیچھا نہیں چھڑا سکتے ۔ ہمارا سب سے پہلا کام تو یہ ہے کہ ہم اپنی موجودہ زبان کی صلاحتیں دیکھیں، پھر یہ غور کریں کہ اب اس میں اظہار کے اور کون کون سے طریقے ایجاد کیے جا سکتے ہیں ۔ لیکن ہمارے نقاد بڑی آسانی سے کہہ دیتے ہیں کہ مغربی ادب میں جتنی اچھی باتیں تھیں وہ سب ہم نے سیکھ لیں اور ہمارا ادب مغربی ادب کے برابر ہوگیا ۔ لیکن آپ کسی مغربی کتاب کا ترجمہ کرنے بیٹھیں تو پانچ منٹ میں سب حقیقت کھل جاتی ہے ۔ بشرطیکہ آپ یہ جانتے ہوں کہ مصنف لکھتا کس طرح ہے ۔ پھر اوپر سے مشکل یہ ہے کہ اگر آپ ترجمہ کے مسائل سمجھ بھی لیں، اور ان کا کوئی نہ کوئی حل بھی تلاش کرنا چاہیں تو اردو تنقید راستہ روک لیتی ہے، وہ اس طرح کہ اردو میں ترجموں کا سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ پبلشر صرف وہی کتاب چھاپتے ہیں جو بک سکیں ۔ ادھر کتابیں

خریدنے والوں کے ذہن کو اردو تنقید نے کمزور کر رکھا ہے ۔ اب اگر آپ ترجمے کو تخلیق بنانا چاہیں تو یہ کیسے ممکن ہے ؟

اس ضمن میں اگر میں اپنے ترجموں کا ذکر کروں تو آپ یہ نہ سمجھیے گا کہ میں اپنی کتابوں کا اشتہار دے رہا ہوں میں تو صرف یہ بتاؤں گا کہ میرے ترجمے ناکام کیوں رہے ۔ مجھے مسائل کیا پیش آئے ، اور میں انہیں حل کیوں نہیں کر سکا ۔

میرے بعض کرم فرما مجھ سے کہتے ہیں کہ میرا سب سے اچھا ترجمہ "آخری سلام" ہے ۔ اس رائے سے میری ہمت افزائی تو بہت ہوتی ہے لیکن میں اسے اپنا کوئی کارنامہ نہیں سمجھتا ۔ اشروڈ کی یہ کتاب حقیقت نگاری کی روایت سے متعلق ہے ۔ لیکن اس کی نثر موپاساں کی نثر نہیں ہے ۔ اس کی زیادہ تر دلچسپی واقعات یا کردار نگاری میں ہے ۔ اس کی نثر بس کام چلاؤ قسم کی ہے ۔ ایسی عبارت کو اردو میں کس طرح منتقل کیا جائے اس کا طریقہ منٹو نے ۴۶ء کے قریب اپنے ترجموں میں بتا دیا تھا ۔ اب اگر آپ کو تھوڑے بہت محاورے آتے ہوں اور ادبی نثر کو گفتگو کے لب و لہجہ سے قریب لا سکیں تو اس کتاب کا اچھا خاصا ترجمہ ہو سکتا ہے ۔ میرا خیال ہے کہ اپنے ترجمے میں چاہے میں اشروڈ کی برابری نہ کر سکا ہوں ۔ لیکن ترجمہ پڑھنے کے بعد اصل کتاب پڑھنے کی کوئی خاص ضرورت باقی نہیں رہتی ۔ جس قسم کی نثر اس کتاب کے ترجمے کے لیے چاہیے اس کا ڈھانچہ بنا بنایا تھا ۔ اردو والے ترجمے میں بس اتنی بات دیکھتے ہیں کہ روانی اور سلاست ہو اور پڑھتے ہوئے ایسا لگے جیسے کتاب اردو ہی میں لکھی گئی ہے ۔ تعلی معاف ۔ یہ کام تو میں سوتے ہوئے بھی کر سکتا ہوں لیکن اس سے اردو ادب کو کیا فائدہ پہنچتا ہے ؟ اس میں شک نہیں کہ اس سے ترجمے کا کام بہت ہلکا ہو جاتا ہے ۔ لیکن ہماری زبان وہیں کی وہیں رہتی ہے ، جہاں تھی ۔ نثر کی اسی تعریف نے ہمارے ادب کو مار رکھا ہے۔ خصوصاً ترجمے کو ۔ اگر ہمارے نقاد پڑھنے والوں کو یہ راز بتا دیتے کہ پڑھتے وقت دماغ پر زور پڑے تو کوئی ہرج نہیں تو شاید اردو نثر میں ترجمے ہی کے ذریعے کچھ تجربے ہو

سکتے ۔ لیکن اب تو ایک لفظ کو ادھر سے اُدھر کرتے ڈر لگتا ہے کہ ایسی کتاب پڑھے گا کون ۔ اگر آپ کی اردو زبان میں بہت سے اسالیب بیان ہوتے تب تو یہ مطالبہ بجا تھا کہ ترجمہ ایسا لگنا چاہیے جیسے اصل ہو ۔ لیکن اس بے بضاعتی کے عالم میں یہ شرط لگانا کہ اردو کے اسالیب میں کسی قسم کی تبدیلی نہ ہونے پائے ، ایک عجیب سی بات ہے ۔ اگر یہ ذہنیت ہمارے ادب پر اسی طرح حاوی رہی تو رابلے یا جوئیس کی طرح کے لوگوں کے ترجمے تو قیامت تک نہ ہو سکیں گے ۔ اب سے آٹھ سال پہلے مجھے یہ خبط تھا کہ ترجمہ کرتے ہوئے اردو کے اسالیب کا خیال نہ رکھوں لیکن اب اردو کے نقادوں سے ڈر گیا ہوں اور اتنی ہمت نہیں رہی ۔ وہ تو میرے پبلشر ہمت والے ہیں کہ میں اردو کو توڑ مروڑ ڈالوں تو بھی میری کتاب چھاپ دیتے ہیں ۔

میرے جس ترجمے کو غور سے پڑھا جانا چاہیے تھا وہ ہے "مادام بواری" یعنی ایک ناکامیاب ترجمے کی حیثیت سے ۔ اول تو اس کتاب کا صحیح ترجمہ آج تک ہوا ہی دنیا کی کون سی زبان میں ہے ۔ اردو تو بچاری پھر بھی بچی ہے ۔ یہ کتاب تو اس قابل ہے کہ اردو کے آٹھ دس ادیب مل کر اُسے ترجمہ کرتے ۔ اور اس پر تین چار سال لگاتے ، تب کہیں جا کر کچھ بات بنتی ۔ میں یہ دعوے نہیں کر سکتا کہ اس کتاب میں نثری اسلوب کے جتنے مسائل سامنے آتے ہیں ۔ میں نے ان سب کو سمجھ لیا ۔ اس کام کے لیے بھی سال بھر چاہیے ۔ بہرحال جو دو چار باتیں میرے پلے پڑیں وہ میں نے اردو میں پیدا کرنی چاہیں مثلاً ایک تو میں نے یہ کوشش کی کہ فلوبیئر نے علامات اوقاف کے ذریعے جو معنی پیدا کیے ہیں ویسے ہی میں بھی کروں۔ لیکن کاتب صاحب نے سب گڈمڈ کرکے رکھ دیا ۔ پھر فلوبیئر نے بار بار مختلف قسم کے خیالات کو تقابل یا تضاد کے لیے ایک ہی جملے میں بند کیا ہے ۔ میں نے ایسے جملوں کا مطلب لکھنے کے بجائے انہیں ویسے کے ویسے ہی اردو میں منتقل کر دیا ۔ اردو والوں نے شکایت کی کہ ترجمے میں روانی اور سلاست نہیں ہے ۔ مثلاً "مادام بواری" کے پہلے صفحہ پر شارل کی ٹوپی کا بیان لیجیے ۔ اگر محض روانی

اور سلاست کا معاملہ ہوتا تو میں "حاجی بغلول" کے انداز میں اس ٹوپی کا مزے دار سے مزے دار بیان لکھ سکتا تھا ۔ لیکن میرے سامنے تو سوال یہ تھا کہ فلوبیئر کے ایک جملے کا ترجمہ کیا جائے ، چاہے اردو زبان چیں بول جائے یہی میں نے کیا ۔ لوگوں نے شکایت کی کہ ترجمے کے پہلے صفحے کی عبارت گنجلک ہے ۔ مجھے خوشی تو جب ہوتی کہ کوئی صاحب اس جملے کا اور اچھا ترجمہ کرکے مجھے بھیجتے جسے میں کسی رسالے میں شائع کراتا کہ اردو نثر کے ایک مسئلے کا کچھ تو حل نظر آیا۔ یہ تو فلوبیئر کی کتاب کے چھوٹے چھوٹے مسئلے ہیں ۔ اور بڑے مسئلوں سے الجھنے کی تو مجھ میں ہمت ہی نہیں تھی ۔ مثلاً جملوں کے آہنگ یا پیرا گراف کی تعمیر کا معاملہ تو اتنا سخت تھا کہ میں نے بھاری پتھر سمجھا اور چوم کے چھوڑ دیا ۔ بہرحال اردو والوں نے ناول پڑھ لیا اور یہ صرف دو ڈھائی لوگوں کو معلوم ہے کہ اس ترجمے میں میری کامیابی کیا تھی اور ناکامیابی کیا ۔

پچھلے سال میں نے استاں دال کے ناول "سرخ و سیاہ" کا ترجمہ کیا اس ناول نے مجھے رلا رلا دیا ۔ اگر سلاست اور روانی کی بات ہوتی تو میں لیٹے لیٹے ترجمے کے پچاس صفحے روز لکھوا سکتا تھا ۔ لیکن استاں دال ، تو کمبخت وہ آدمی ہے جو نثر کے فن کو نظم کے فن سے بڑا سمجھتا ہے اب میرے سامنے سوال یہ تھا کہ اردو سے غداری کروں یا استاں دال سے مجھے اعتراف ہے کہ میں نے اپنے پبلشر کے مفاد کا احترام کرتے ہوئے استاں دال سے غداری کی ۔ کیونکہ پبلشر بچارے کی یہی ہمت کیا کم ہے کہ اتنا لمبا چوڑا ناول چھاپا ۔ لیکن ایک لحاظ سے اردو زبان نے بھی میرے ہاتھ باندھ دیے تھے ۔ استاں دال جذبات کا تجزیہ فکر محض کی زبان میں کرتا ہے ۔ اردو میں اس کی صلاحیت نہیں ۔ اگر میں اس کے لیے کوئی نیا اسلوب بنانے کی کوشش کرتا تو ڈر یہ تھا کہ اردو کے نقاد پوچھیں گے ، یہ ناول ہے یا مقالہ ۔ مرتا کیا نہ کرتا ۔ میں نے استاں دال کی روح سے معافی مانگ کے اس کی خشک عبارت کو تھوڑا سا جذباتی رنگ دیا ، یا یوں کہیے کہ اردو کے نقادوں کو رشوت دی ۔ اب ایک اور

مشکل پیش آئی ۔ پہلی نظر میں تو استاں دال کے جملے بڑے خشک اور بے رنگ معلوم ہوتے ہیں ۔ لیکن ذرا غور سے پڑھیے تو ایک کراراپن ، اور ایک ایسی چستی ملے گی جو طنز کے قریب پہونچ جاتی ہے ۔ یہ ایسی چیز ہے جو انگریزی ترجمے میں بھی نہیں آنے پائی ۔ حالانکہ یہ ترجمہ اسکاٹ مونکریف جیسے بڑے مترجم نے کیا ہے ۔ قصہ یہ ہے کہ استاں دال کی نثر کے پیچھے ڈیڑھ سو سال کی وہ فرانسیسی روایت ہے ۔ جو (Maximes) لکھنے والوں نے پیدا کی تھی ، استاں دال کی نثر کے پیچھے سے جگہ جگہ روش فوکو بول اٹھتا ہے ۔ اب بتائیے اس خوبی کو اردو میں منتقل کرنے کے لیے میں ایسی روایت کہاں سے لاتا ؟ نیاز فتحپوری کی زبان میں اس کا ترجمہ کرتا ۔ یا میر امن کی زبان میں ؟ اردو ادب بہت عظیم سہی ۔ لیکن کوئی صاحب مجھے چار سطریں استاں دال کی ترجمہ کرکے دکھاویں ۔

آج کل میں شو ور لوولا کلو کا ناول ترجمہ کر رہا ہوں ۔ اس میں ایک نئی مصیبت ہے ۔ مصنف کا لب و لہجہ اردو میں کیسے پیدا کروں یہ میری سمجھ میں نہیں آ رہا ۔ پھکڑپن کا نمونہ تو مجھے سرشار یا سجاد حسین کے یہاں مل سکتا ہے ۔ لیکن اٹھارویں صدی کے فرانسیسی استہزا میں جو رکھ رکھاؤ اور نفاست تھی وہ کہاں سے لاؤں ؟ لیکن اس ناول کے متعلق اتنی بات ضرور کہوں گا ۔ استاں دال کا ترجمہ سرشار مجھ سے اچھا نہیں کر سکتے تھے لیکن اس ناول کو ترجمہ کرکے وہ کچھ نہ کچھ ضرور بنا سکتے تھے اور میں یہ بھی نہیں کر سکتا ۔ اس کا مطلب ہے کہ اردو نثر میں جو بات تھی ، آج وہ بھی نہیں رہی ۔

اپنے ترجموں کا اتنا لمبا چوڑا اشتہار میں نے اس لیے دیا کہ اپنے اس کام کے سلسلے میں مجھے جن ادبی مسائل سے الجھنا پڑا میں انھیں حل نہیں کر سکا ۔ میں نے دو چار بڑی کتابوں کے ترجمے تو کر ڈالے ہیں لیکن میں نے اردو کے اسالیب میں رتی بھر بھی اضافہ نہیں کیا ۔ اسی کی شکایت مجھے اردو پڑھنے والوں اور اردو کے نقادوں سے ہے ۔ اول تو میری بساط ہی کیا ہے ۔ لیکن میں چاہوں بھی تو اسلوب کا کوئی نیا تجربہ کرنے کی

ہمت نہیں پڑتی ۔ چنانچہ مجھے اپنے آپ سے بار بار یہ سوال پوچھنا پڑتا ہے کہ جن ترجموں سے تخلیقی ادب پر کوئی اثر نہ پڑے ان کا جواز کیا ہے ۔ ترجمے کا تو مقصد ہی یہ ہونا چاہیے کہ خواہ ترجمہ ناکام ہو ، مگر ادیبوں اور پڑھنے والوں کے سامنے ذرائع اظہار کے نئے مسائل آئیں ، خواہ کوئی ادبی مسئلہ حل نہ ہو مگر ترجمے کے ذریعے کوئی ادبی مسئلہ پیدا تو ہو ۔ لیکن جب تک اردو تنقید زندہ ہے خدا نے چاہا تو ہمارے ذہن میں کوئی ادبی مسئلہ پیدا ہو ہی نہیں سکتا ۔

ترجمے کے مسائل[1]

عام طور پر کسی ترجمے کو اچھا سمجھ کر جب اس کی تعریف کی جاتی ہے تو کہا جاتا ہے کہ اس میں بڑی روانی ہے ۔ زبان با محاورہ اور سلیس ہے اور مضمون واضح ہے ۔ لیکن غور سے دیکھا جائے تو صرف سلاست و روانی ہی ترجمے کی بنیادی خصوصیات نہیں ہیں ۔ آپ خود ہی سوچیے کہ سنجیدہ و پیچیدہ تحریر کا ترجمہ صرف و محض رواں و سلیس کیسے ہو سکتا ہے جب کہ دوسری زبان کا مزاج اور جملوں کی ساخت ہماری زبان کے مزاج اور جملوں کی ساخت سے مختلف ہو ۔ جب کہ ایک طرف ہمارے ہاں طویل جملے لکھنا مشکل کام ہو اور دوسری طرف قول محال اور جملۂ معترضہ کا رواج بھی جدید روش کے ساتھ شروع ہوا ہو ۔ ترجمہ کے ذریعہ زبان ایک نئے مزاج سے روشناس ہو کر پھیلتی اور بڑھتی ہے ۔ نئے لہجوں اور جملوں کی نئی ساخت کو اپنے مزاج میں جذب کر کے اظہار کی نئی قوتوں سے متعارف ہوتی ہے ۔ ترجموں کی اہمیت یہ ہے کہ ایک طرف تو اس کے ذریعہ نئے خیالات زبان میں داخل ہوتے ہیں جس سے ذہنی جذب و قبول کا سلسلہ جاری رہتا ہے اور دوسری طرف زبان کی قوت اظہار میں نئے امکانات پیدا ہو جاتے ہیں اور وہ زبان بھی بدلتے ہوئے طرز احساس کے بیان پر قدرت حاصل کر کے احساس و خیال کی نئی نئی تصویریں ابھارنے کی اہل ہو جاتی ہے ۔

۱۔ تنقید اور تجربہ از جمیل جالبی مشتاق بک ڈپو سٹیلٹن روڈ کراچی نمبر ۱، ۱۹۶۷ جلد اول صفحات ۱۲۱–۱۲۶ ۔

اکثر ترجمہ کی تعریف میں یہ بھی کہا جاتا ہے کہ وہ بالکل اصل معلوم ہوتا ہے۔ یہ ایک ایسی غلطی ہے جو ہمارے ہاں افسانوں اور ناولوں کے آزاد ترجموں کی وجہ سے راہ پا گئی ہے۔ ایسے میں پڑھنے والا ان ترجموں کو صرف کہانی کی دلچسپی کے لیے پڑھتا ہے اور یہی مقصد ترجمہ کرنے والوں کے سامنے ہوتا ہے لیکن ان ترجموں سے زبان و بیان کو کوئی خاص فائدہ نہیں پہنچتا۔ جب کسی ادب پارے کا ترجمہ کیا جائے گا تو اس میں وہ روانی ہرگز پیدا نہیں ہو سکتی جو خود اپنی زبان میں براہ راست لکھنے سے پیدا ہوتی ہے اور جب وہ روانی ترجمہ میں پیدا نہیں ہو سکتی تو ترجمہ اصل کیسے معلوم ہوگا؟ ایسے میں مترجم کا یہ فرض ہے کہ وہ مصنف کے لہجے اور طرز ادا کا خیال رکھے۔ لفظوں کا ترجمہ قریب قریب معنی ادا کرنے والے الفاظ سے نہ کرے اور ضرورت پڑنے پر نئے مرکب بنائے، نئی بندشیں تراشے اور نئے الفاظ واضع کرے۔ ایسے ترجمے سے آخر کیا فائدہ جو سلاست و روانی تو پیدا کر دے لیکن مصنف کی روح، اس کے لہجے اور تیور کو ہم سے دور کر دے اور ساتھ ساتھ زبان کے مزاج کو اسی طرح روائتی روش اور اظہار بیان پر قائم رکھے اور اس میں کسی اضافے، اسلوب کے نئے امکان یا بیان کے نئے تجربے کی کوشش نہ کرے۔ میرے سامنے ترجمے کا معیار یہ رہا ہے کہ اگر ترجمہ کو دو ایسے آدمیوں کو دکھایا جائے جن میں سے ایک اس زبان سے جس کا ترجمہ کیا گیا ہے اچھی واقفیت رکھتا ہو اور دوسرا اس زبان سے گہری دلچسپی اور واقفیت رکھتا ہو اور پہلا ترجمہ کو دیکھ کر کہے کہ ”بات تو خوب ہے اصل مصنف کون ہے“؟ اور دوسرا یہ کہے کہ مصنف تو یقیناً مسٹر ایلیٹ ہیں۔ لیکن یہ یاد نہیں پڑتا کہ یہ حصہ ان کے کس مضمون یا تحریر کا ترجمہ ہے۔ تو میں اسے ترجمے کی کامیابی سمجھوں گا۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ مترجم نے مصنف کے طرز بیان اس کے لہجے اور مزاج کو اس حد تک باقی رکھا ہے کہ خود ترجمے میں اصل مصنف کی روح بول رہی ہے اور یہی وہ چیز ہے جو میرے خیال میں ہر اچھے ترجمے میں ہونی چاہیے۔ زبان کے مزاج کو بدلنے سے نئے امکانات

اور طرز ادا کے نئے نئے ڈھنگ سے روشناس کرانے میں اچھے مترجم کا بڑا ہاتھ ہوتا ہے۔ ترجمے کے ذریعہ ایک زبان کی تہذیب دوسری زبان کی تہذیب کے ساتھ مل کر نئے نئے گل کھلا سکتی ہے۔ فارسی و عربی زبان اور خصوصاً فارسی زبان کے اسالیب نظم و نثر نے ہماری زبان، اس کے اسالیب اور خود ہمارے طرز احساس کو متعین کرنے میں کتنا اہم کردار ادا کیا ہے۔ یہ کوئی ایسی بات نہیں ہے جس پر کسی بحث کی ضرورت ہے۔ اسی طرح ہماری جدید نثر و نظم پر انگریزی زبان کے اسالیب کا جو اثر پڑا ہے وہ بھی بہت واضح اور دور رس ہے۔ ایک زبان پر دوسری زبان کے اثرات صرف ”تحریری ترجموں ہی سے مرتب نہیں ہوتے بلکہ ان ذہنی ترجموں سے بھی پیدا ہوتے ہیں جو پڑھنے والا کسی غیر زبان کی تصانیف اور تحریریں پڑھتے وقت غیر شعوری طور پر کرتا جاتا ہے۔ مثلاً جب آپ کوئی انگریزی کتاب پڑھتے ہیں تو انگریزی زبان پر عبور رکھنے کے باوجود آپ کا لا شعور اس کے مفہوم اور لہجے کا ترجمہ اپنی زبان میں کرتا جاتا ہے اور یہ خیالات، یہ لہجے اور اظہار کے اسالیب آپ کے شعور کا حصہ بنتے جاتے ہیں۔

بہر حال میں اپنی بات کو یہاں صرف تحریری ترجموں تک محدود رکھوں گا۔ تحریری ترجموں کے تین طریقے ہو سکتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ لفظوں کے آہنگ، مصنف کے لہجے، بیان کے تیور اور ابلاغ کو کوئی خاص اہمیت نہ دی جائے اور اصل متن کا صرف لفظی ترجمہ کر دیا جائے اور بس۔ اسے ترجمہ کرنا نہیں کہتے، مکھی پہ مکھی مارنا کہتے ہیں۔ دوسرا طریقہ یہ ہو سکتا ہے کہ مفہوم لے کر آزادی کے ساتھ اپنی زبان کے روائتی و مقبول انداز بیان کی مدد سے 'ترجمہ' کر دیا جائے۔ جہاں جی میں آیا حسب دلخواہ تبدیلی بھی کر لی۔ تیسرا طریقہ یہ ہے کہ ترجمہ اس طور پر کیا جائے کہ اس میں مصنف کے لہجے کی کھنک اور آہنگ بھی باقی رہے۔ اپنی زبان کا مزاج بھی بنیادی طور پر موجود رہے اور ترجمہ اصل متن کے مطابق بھی ہو۔ ترجمہ کی یہ شکل سب سے زیادہ مشکل ہے۔ ایسا ترجمہ جس میں مترجم نے مصنف کی اصل روح کو پا کر

اپنی زبان کے مزاج میں نگینے کی طرح بٹھا دیا ہو۔ ایک ایسا ہی گوہر نایاب ہے جیسے ادب کا کوئی شہ پارہ جو کبھی کبھار وجود میں آ کر کسی تہذیب کی ساری روح کا مظہر بن جاتا ہے۔ ایسے ترجموں سے زبان و بیان کو ایک فائدہ تو یہ پہنچتا ہے کہ زبان کے ہاتھ بیان کا ایک نیا ڈھنگ اور اسلوب کا ایک نیا امکان آ جاتا ہے۔ دوسرے جملوں کی ساخت ایک نئی شکل اختیار کر کے اپنی زبان کے اظہار کے سانچوں کو وسیع تر کر دیتی ہے۔ اب جب کہ زبانوں کے رشتے زیادہ وسیع ہو کر ایک دوسرے سے قریب تر ہو رہے ہیں ضرورت اس امر کی ہے کہ مترجمین بھی اظہار کے سانچوں اور جملوں کی ساخت کا خاص طور پر خیال رکھ کر اسالیب کے نئے امکانات کو ابھاریں۔ ہماری زبان کا قدیم اسلوب ازکار رفتہ ہو چکا ہے۔ یہ ہمارے بدلتے ہوئے طرز احساس کے اظہار کے لیے موزوں نہیں ہے۔ اچھے ترجموں کے ذریعہ ہم اسالیب کے نئے امکانات تلاش کر سکتے ہیں۔ خاص طور پر ایک ایسے دور میں (جیسا کہ ہمارا دور ہے) جب ادب اور کلچر پر مردنی چھائی ہوئی ہے ہم اچھے ترجموں کے ذریعہ تخلیقی فضا ہموار کر سکتے ہیں۔

عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ مترجم میں کام کرنے کا محرک یہ ہوتا ہے کہ اپنے دماغ پر زور ڈالے بغیر کسی دوسرے کے پھلوں کو اپنی زبان کے خوان میں رکھ کر پیش کر دے۔ اگر کتاب کا مصنف مشہور ہو تو اس کے سہارے مترجم کو بھی شہرت کے پر لگ گئے۔ حالانکہ دیکھا جائے تو معاملہ اس کے برعکس ہوتا ہے۔ ترجمہ کرنے والا اپنی شخصیت اور مزاج کو کھو کر دوسرے کی شخصیت اور مزاج میں انہیں تلاش کرتا ہے۔ کھو کر پانا اور پا کر کھونا اچھے ترجمے کے بنیادی عناصر ہیں۔ اچھا ترجمہ اسی وقت وجود میں آ سکتا ہے جب مترجم نے نیک نیتی کے ساتھ اپنی شخصیت کو کھو کر مصنف کی شخصیت میں تلاش کرنے کی کوشش کی ہو۔ اپنی ذات کی نفی اور اپنی شخصیت سے انکار ایک اچھے مترجم کے لیے ضروری ہے۔ بہر حال ایک طرف تو مترجم کی ذات مصنف کی ذات سے ہمیشہ کمتر رہتی ہے اور دوسری طرف اس کے

برخلاف مصنف کی شخصیت ترجمہ کے ذریعہ پھیل کر اور بڑی ہو جاتی ہے۔ اپنی ذات ہو تو آدمی اسے سو رنگ سے باندھنے کی کوشش کر لے لیکن ترجمے میں تو خود آدمی بندھ کر رہ جاتا ہے۔ مصنف کے ہاتھ میں اس کی باگ ڈور ہوتی ہے۔ اگر اس نے گرفت سے نکلنے کی کوشش کی تو اصل سے دور ہو جاتا ہے۔ اس کے بالکل مطابق رہنے کی کوشش کی تو بیان میں اجنبیت در آتی ہے۔ جملوں کو توڑ کر اپنے طور پر بیان کرنے کی کوشش کی تو اس کی زبان اظہار و بیان کے نئے امکانات سے محروم ہو جاتی ہے۔ ایسے میں جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں اور اسی بات پر پھر زور دینا چاہتا ہوں، مترجم کا کام یہ ہے کہ وہ دوسری زبان کے اظہار کو اپنی زبان کے اظہار سے ملا کر ایک نئے اسلوب کے لیے راستہ ہموار کرے۔ ایسے ترجموں میں ممکن ہے آپ کو اجنبیت کا احساس ہو لیکن اس اجنبیت سے جب آپ مانوس ہو جائیں کے تو خود محسوس کریں گے کہ اب زبان خیال و احساس کے بوجھ تلے دب کر نہیں رہ گئی ہے بلکہ اس میں اثر آفرینی کے ساتھ بیان کرنے کی صلاحیت پیدا ہو گئی ہے۔ ایسے ترجمے روا روی میں نہیں پڑھے جا سکتے اور نہ ان کا حسن اور ان کی دلکشی ایک ہی نظر میں آپ کے دیدہ و دل تک پہنچ سکتے ہیں بلکہ ایسے ترجموں کو آپ پلاٹ، کہانی یا موضوع کی دلچسپی و افادیت سے کہیں زیادہ نئے تہذیبی رویوں اور طرز بیان کے نئے امکانات کے لیے پڑھیں گے۔ ایلیٹ نے ایک جگہ لکھا ہے کہ ”جب ایک زبان دوسری زبان سے سبقت لے جانے لگتی ہے تو عام طور پر اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ وہ زبان ایسے فوائد اپنے اندر رکھتی ہے جو اسے آگے بڑھاتے ہیں اور جو اپنے اور غیر مہذب زبان کے درمیان نہ صرف فکر و لطافت اظہار کے اعتبار سے امتیاز رکھتی ہے بلکہ احساس کے اعتبار سے بھی بلند درجہ رکھتی ہے“۔ اس بحرانی دور میں جب ہماری تہذیبی اکائی ٹوٹ گئی ہے، طرز احساس تیزی سے بدل رہا ہے اور پرانے اسالیب ہمارے تجربوں کے اظہار سے معذور ہیں۔ میرا خیال ہے اور یہ خیال یقیناً غلط نہیں ہے کہ ہم ترجموں کے ذریعہ اپنی زبان میں فکر و لطافت اظہار کے نئے امکان روشن کر سکتے ہیں۔

تراجم اور اصطلاح سازی کے مسائل[۱]

زبان کی سہولت کے لیے، تین قسمیں کی جا سکتی ہیں ۔ ایک کاروباری زبان جس میں اپنا مطلب کسی طرح نکالنا ہوتا ہے ، جس میں معنی کی ایک ہی سطح پر توجہ ہوتی ہے ، جس میں منطقی ترتیب ، بہتر لفظ یا موزوں ترین لفظ کی قید نہیں ہے ۔ یہ زبان اسم ، صفت یا فعل کے سیدھے سادے استعمال سے کام چلاتی ہے ۔ دوسری قسم ادبی زبان کی ہے جس میں لفظ کا تخلیقی استعمال شاعری میں اور تعمیری استعمال نثر میں ہوتا ہے ۔ ادبی زبان میں ماورائے سخن بھی بات ہوتی ہے ۔ یہ زبان تشبیہ ، استعارے ، علامت اور رمز و ایما کی وجہ سے گنجینۂ معنی کا طلسم ہوتی ہے ۔ یہاں کیا کہا گیا ہے اس سے زیادہ کیسے کہا گیا ہے پر توجہ ہوتی ہے۔ بقول مڈلٹن مرے یہاں الفاظ پر فتح کا ایک منظر سامنے آتا ہے کیونکہ لفظ ایک پہلو دار ہیرے کی طرح بہت سی شعاعیں دیتا ہے اور ایک سے زیادہ معنی میں استعمال ہوتا ہے ۔ یہاں پیچیدگی ، ابہام ، اندیشہ ہائے دور دراز کی کافی گنجائش ہے ۔ تیسری قسم علمی زبان کی ہے جس سے ہمیں اس وقت بحث ہے ۔ علمی زبان میں اظہار منطقی ہوتا ہے ، حقیقی مفہوم ادا کرنے پر توجہ ہوتی ہے ، کاروباری زبان میں سیدھے سادے خیال اور فوری مطلب کو ادا کرنے کی کوشش ہوتی ہے ۔ علمی زبان میں پیچیدہ سے پیچیدہ خیال کو اس طرح ادا کیا جاتا ہے کہ وہ ذہن میں روشنی

۱۔ نظر اور نظریے از آل احمد سرور مکتبۂ جامعہ لمیٹڈ نئی دہلی ، صفحات ۲۵۰—۲۷۱ ۔ ترقی اردو بورڈ دہلی کے اصطلاح سازی پر سیمینار میں پڑھایا گیا ۔

کر دے ۔ مہذب زبان کی یہی پہچان ہوتی ہے کہ وہ ادبی اظہار اور علمی اظہار دونوں کے لیے سرمایہ رکھتی ہو ۔ کاروباری اظہار تو زبان کی ابتدائی حالت میں بھی کسی نہ کسی طرح ہو ہی جاتا ہے ۔

مشرقی زبانوں کی ایک خصوصیت یہ بتائی گئی ہے کہ وہ جذباتی اظہار پر تو پوری طرح قادر ہیں مگر ذہنی اظہار کے لیے انہیں ابھی بہت ترقی کرنا ہے ۔ گویا ادبی اظہار کے علاوہ علمی معیار سے بہت ترقی کی گنجائش ہے ۔ ایک زمانے میں شاعری علوم کی زبان بھی تھی مگر رفتہ رفتہ اس نے اپنے مخصوص کردار کو پہچان لیا ۔ اب مغرب میں کوئی تاریخ نظم نہیں کرتا نہ منظوم جغرافیہ لکھتا ہے ، نہ نفسیات اور معاشیات کے مسائل نظم کرتا ہے ۔ شاعری فرد کے جذبے کی ترجمان بن گئی اور نثر اس کے ذہن کی۔ علمی نثر کی ترقی اسی میلان کا نتیجہ ہے ۔ اس ترقی نے شاعری کو بھی فائدہ پہنچایا ہے کیونکہ ادبی اظہار اور علمی اظہار الگ الگ راستوں پر گامزن ہونے کے باوجود چور دروازوں اور پگڈنڈیوں کے ذریعے سے ایک دوسرے سے متاثر ہوتے ہیں ۔

ایسا نہیں ہے کہ مشرقی زبانوں میں علمی اظہار کی کوئی روایت نہیں ہے یا علمی زبان بہت کم ملتی ہے ، خود اردو ہی کو لے لیجیے ۔ اس میں علمی نثر انیسویں صدی کے وسط سے ملنے لگتی ہے ۔ اور سر سید اور ان کے رفقاء کے ہاتھوں اسے بڑی ترقی ہوئی ۔ مگر اس میں شک نہیں کہ علمی زبان پر ادبی زبان و اسالیب کا اثر زیادہ رہا ہے چنانچہ آج بھی علمی نثر کی تعریف کرتے وقت اس کی سلاست ، شگفتگی ، روانی پر زور دیا جاتا ہے اور کبھی کبھی تو یہ بھی کہہ دیا جاتا ہے کہ اس میں افسانے کی سی دلچسپی ہے ۔

اس وجہ سے ضرورت ہے کہ ہم آج کی صحبت میں سب سے پہلے علمی نثر کی ضروریات پر کچھ غور کر لیں کیونکہ ترقی اردو بورڈ کا کام اس علمی نثر کو فروغ دینا ہے ۔ اس فروغ کا مقصد صرف معلوماتی ادب کا ایک ذخیرہ مہیا کرنا ہی نہیں ، خیال اور ذہن کو تقویت دے کر زیادہ سے زیادہ پیچیدہ مفاہیم اور نازک ترین کیفیتوں کے اظہار پر قدرت حاصل

کرنا اور اس طرح زبان کو وسعت اور جامعیت عطا کرنا ہے۔ علمی نثر کے لیے یہ ضروری نہیں کہ وہ مشکل ہو یا آسان، عجمی لے رکھتی ہو یا ہندی۔ علمی نثر علم کے مطالب کے اظہار کے لیے ہوتی ہے۔ جہاں علم کے مبادیات عام فہم زبان میں بیان کرنا ہیں۔ وہاں وہ آسان ہوگی تو اس کے ساتھ موٹی موٹی باتوں پر اکتفا کرے گی۔ جہاں وہ اس علم کے اسرار و رموز پر روشنی ڈالے گی وہاں اس کا فرض اتنا ہی ہوگا کہ وہ سچ اور صرف سچ بولے اور پوری بات کہے۔ اس لیے اصطلاحات سے اسے لازمی طور پر کام لینا پڑے گا۔ اس کا مقصد معلومات عطا کرنا ہوگا، جذبات سے اپیل نہیں۔ علوم کی بہت قسمیں ہیں انہیں سہولت کے لیے تین خانوں میں بانٹا جا سکتا ہے۔ قدرتی علوم، جس میں طبعی علوم اور حیاتیاتی علوم آتے ہیں۔ سماجی علوم جن میں سیاسیات، اقتصادیات، نفسیات، لسانیات، جغرافیہ، تعلیم آتے ہیں۔ تاریخ کو پہلے انسانی علوم (Humanities) میں رکھا جاتا تھا، اب اسے سماجی علوم میں شامل کیا جاتا ہے۔ انسانی علوم میں فلسفہ، فنون لطیفہ اور ادبیات آتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ قدرتی علوم میں سے طبیعاتی علوم میں نثر کی زبان خالص معلوماتی ہوتی ہے اور اس کا نصب العین ریاضی کی طرح قطعیت حاصل کرنا ہوتا ہے۔ حیاتیاتی علوم میں انواع کے رشتوں کی تفصیل اور ارتقا کی منزلوں کی تشریح کے سلسلے میں بیانیہ انداز کی وہ وضاحت بھی ضروری ہے جس میں ایک خوشگوار پہلو ہو سکتا ہے مگر اسے کسی طرح نمایاں نہ ہونا چاہیے۔ اجتماعی علوم کے سلسلے میں معلومات ہی کا معاملہ نہیں۔ یہاں رشتوں کی پیچیدگی کے علاوہ اسباب و علل کے سلسلے کو بھی ذہن میں رکھنا ہوتا ہے۔ قوموں کی تقدیر، اسرار امم، نفسیات کی بھول بھلیاں، سماج کی سیڑھیاں، کسب زر کی داستان، مختلف خطوں کی آب و ہوا کا طبائع اور نفسیات پر اثر، غرض سماجی علوم میں چونکہ صرف معلومات کا سوال نہیں بلکہ معلومات کی ترتیب، بنیادی اور فروعی مسائل کی تشریح اور مختلف نظریات کے تحت ان کی اہمیت سے بحث ہوتی ہے اس لیے سماجی علوم میں نثر کا کام قدرتی علوم سے زیادہ مشکل ہو جاتا ہے۔ پھر

یہ بھی ہے کہ قدرتی علوم میں زیادہ تر ایک نظریے کے مطابق اظہار خیال ہوتا ہے۔ سماجی علوم کے معاملے میں نظریوں کی کثرت ہے۔ قدرتی علوم کے سلسلے میں مکمل معروضیت ممکن ہے۔ سماجی علوم کے سلسلے میں اس کی کوشش ضروری ہے مگر شخصی نظر یا داخلی انداز کا دخل بھی ہو ہی جاتا ہے جس کی وجہ سے جذبے کی زبان کو کچھ بار مل جاتا ہے۔ مگر نصب العین یہاں بھی معروضیت ہے۔ انسانی علوم میں فلسفہ علم کی وہ شاخ ہے جہاں مجرد تصورات سے بحث ہے، جلووں کی کثرت میں ایک وحدت دیکھنے کی سعی ہے یا دوسرے الفاظ میں ایک نظام فکر بنانے یا ایک ذہنی محور پانے کی جستجو، اس لیے فلسفے کی بنیاد منطق پر ہے اور استدلال اس کا طریقہ کار ہے۔ برٹرنڈ رسل نے کہا ہے کہ شوپنہار، نتشے اور برگسان کو خالص فلسفی اس لیے نہیں کہا جا سکتا کہ ان کے یہاں ادبیت بھی در آئی ہے۔ یعنی ان کی بظاہر طاقت در اصل ان کی کمزوری ہے۔ کانٹ کے متعلق یہ بات نہیں کہی جا سکتی۔ ادبیات کے سلسلے میں ادبی تنقید علوم کے ذیل میں آتی ہے۔ اس لیے جدید دور میں اسے زیادہ سائنٹیفک بنانے پر زور دیا گیا ہے لیکن چونکہ یہ بہر حال ادب کی ایک شاخ ہے اس لیے اور سائنسی ہوتے ہوئے بھی ادبی اظہار سے اپنا رشتہ توڑ نہیں سکتی، ہاں تاثرات کی دلدل سے اسے ضرور نکلنا ہے۔

اس تمہید کا مقصد یہ ہے کہ ہم علوم کی زبان کی خصوصیات ہی کو ذہن میں رکھیں، معلومات دینے کو سب سے زیادہ اہمیت دیں، پھر منطقی ترتیب، معروضیت اور ایک غیر جانب دار زبان کو جو جذبے کی گرمی یا شخصیت کے لمس سے بڑی حد تک آزاد ہو۔ ان اصولوں کی روشنی میں ہمیں ترقی اردو بورڈ کے تراجم اور تصانیف کے کام کو آگے بڑھانا ہے۔

ترجمے کے کام کو اب تک تصنیف کے مقابلے میں عام طور پر حقیر سمجھا گیا ہے۔ یہ بہت غلط میلان ہے۔ ترجمے کی اہمیت کسی طرح تخلیق سے کم نہیں۔ ترجمے میں تخلیق کو از سر نو پانا ہوتا ہے اس

لیے امریکہ میں ترجمے کے لیے دوبارہ تخلیق (Recreation) کا لفظ بھی استعمال کیا گیا ہے ۔ ترجمے کے ذریعے سے ہم دوسری زبانوں کے افکار و اقدار سے آشنا ہوتے ہیں ۔ ایک فاضل کے الفاظ میں مترجم کا کام صرف لسانیاتی نہیں بشریاتی (Anthropological) بھی ہے یعنی اسے صرف اصل زبان (Source Language) سے ہی واقفیت نہیں ہونی چاہیے ، اسے اس زبان کی تہذیب اور معاشرے سے بھی آشنا ہونا چاہیے ۔ اس کی دو مثالیں دینا ضروری ہیں تاکہ بات واضح ہو جائے ۔ دارالترجمہ جامعہ عثمانیہ کے لیے روم کی تاریخ کے ترجمے میں (Papal Bulls) کا ترجمہ پاپائی سانڈ کیا گیا تھا ۔ اردو کے ایک ممتاز ادیب نے اپنی کتاب میں شیکسپیر کے ایک ڈرامے As you like it سے ژاک کی ایک تقریر کا حوالہ دیا ۔ اس میں لفظ (Humour) کا ترجمہ مزاح کیا گیا تھا حالانکہ یہاں طبی اصطلاح خلط مراد ہے ۔

مغرب کی رومانی تحریک میں مشرق ادب کے تراجم کا بڑا اثر ہے ۔ جدیدیت کی تحریک میں چین اور جاپان کی شاعری کے تراجم کا بھی دخل ہے ۔ ہندوستان کی نشاۃ الثانیہ پر مغربی ادب کے تراجم براہ راست اثر انداز ہوتے ہیں ۔ ہماری علمی نثر اور جدید نظم دونوں مغربی تراجم کے سہارے آگے بڑھے ہیں ۔ اس لیے ترجمے کی اہمیت کسی طرح تخلیق یا تصنیف سے کم نہیں ۔ یہ تخلیق کے لیے بھی نئے زمین و آسمان دیتا ہے اور علمی موضوعات پر تصانیف کے لیے بھی ذہنی غذا مہیا کرتا ہے ۔ یہاں یہ کہنا بھی ضروری ہے کہ علمی کتابوں کے ترجمے میں آزاد ترجمے یا اصل خیال کو اپنے الفاظ میں بیان کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ۔ یہاں وہی بات ہے کہ خوب ہو ورنہ مقدس چشمے کو ہاتھ نہ لگاؤ ۔ یہاں صرف لفظی ترجمے اور مطابق اصل ترجمے یعنی - (Literal and Faith ful) ، پر گفتگو ہو سکتی ہے ۔ لفظی ترجمے میں لسانیات کی رو سے ایک متنی اظہار کو دوسرے متبادل متنی اظہار میں منتقل کرنا ہوتا ہے لیکن جیسا کہ اوپر کہا گیا ترجمہ صرف لسانیاتی عمل نہیں بشریاتی عمل بھی ہے ۔ اس لیے ظاہر ہے کہ مطابق اصل کو ترجیح ہونی چاہیے کیونکہ ہر

زبان کی صرفی و نحوی خصوصیات علیحدہ ہوتی ہیں ۔ خصوصاً انگریزی ترجمے میں تو لفظی ترجمہ مضحکہ خیز ہو جاتا ہے اس لیے مطابق اصل کے معنی یہ ہوئے کہ اصل زبان کے متن کو ترجمے کی زبان کے ایسے الفاظ میں ڈھالا جائے جو ترجمے کی زبان کی جی نی اس (genius) کے مطابق ہوں مگر اصل زبان کے مفہوم کو زیادہ سے زیادہ ظاہر کرنے پر قادر ہوں ۔ یوں تو ایلیٹ نے یہ بھی کہا ہے کہ کسی زبان کی شاعری کا ترجمہ دوسری زبان میں ناممکن ہے مگر ترجمے ہوئے ہیں اور ان کے اثرات بھی پڑے ہیں ۔ ترجمے کو جووٹ نے ایک مفاہمہ کہا ہے ۔ یہ مفاہمہ بہر حال کبھی زیادہ کامیاب ہوتا ہے کبھی کم ۔ مگر اس سے یہ نتیجہ نہیں نکالنا چاہیے کہ ترجمہ نہیں ہو سکتا یا ترجمہ نہیں کرنا چاہیے ۔ جہاں تک ادب العالیہ یا علمی سرمائے کے ترجمے کا سوال ہے اس سلسلے کی افادیت میں شبہ نہیں کیا جا سکتا ۔ ہاں مطابق اصل ترجمے پر زور دیا جا سکتا ہے ۔ اس ترجمے کے لیے چند شرائط ہیں ۔ مترجم اس موضوع سے واقفیت رکھتا ہو اور اپنی زبان کے سرمائے پر بھرپور نظر کے علاوہ اصل زبان سے بھی اچھی طرح واقف ہو ۔ اگر وہ موضوع سے واقف ہے اور اصل زبان سے بھی بڑی حد تک آشنا ہے مگر اپنی زبان کے سرمائے پر اس کی نظر نہیں ہے تو وہ جا بجا ٹھوکریں کھائے گا ۔ اس کی زبان اکھڑی اکھڑی ہوگی اور اس کا ترجمہ پڑھنا ایسا ہوگا جیسا ناہموار راستے سے گزرنا ۔ اگر وہ اپنی زبان پر عبور رکھتا ہے مگر اصل زبان سے اس کی واقفیت محدود ہے تو ظاہر ہے اور بھی خطرناک صورت پیدا ہو جائے گی پھر علوم کے تراجم میں زبان یا زبانیں جاننے سے بھی مقدم اس علم سے واقفیت ہے اس لیے بھول کر بھی صرف زبان پر یا زبانوں پر عبور کی وجہ سے ترجمے کا کام کسی کو نہ دینا چاہیے ۔ موضوع سے واقفیت بنیادی شرط ہے ، اس کے بعد اصل زبان سے اور پھر اپنی زبان سے ۔ یہی وجہ ہے کہ ڈیٹ رایٹ (امریکہ) کی Mass translation project میں یہ طریقہ برتا گیا ہے ۔

Translator-Quality Control, Technical Editor-Language Editor.

مترجم ، معیار کا نگران ، ٹیکنیکل ایڈیٹر ، زبان کا ایڈیٹر ۔

اس لیے میری رائے میں ترقی اردو بورڈ کو خالص علمی کتابوں کے ترجمے میں پہلے تو موضوع کے ماہر کا انتخاب کرنا چاہیے ۔ اس کے بعد ترجمے کے معیار کو پرکھنے کے لیے ایک دوسرے ماہر کو کتاب دکھانا چاہیے جسے تراجم کا بھی تجربہ ہو ۔ اس کے بعد ٹیکنیکل ایڈیٹر سے مدد لینا چاہیے جو صرف یہ دیکھے کہ مواد کی ترتیب ، اعداد و شمار ، چارٹ وغیرہ درست ہیں ۔ آخر میں زبان کے ماہر کی نظر بھی ضروری ہے تاکہ ترجمہ زبان کی جی‌نی‌اس (genius) کے مطابق ہو اور الفاظ کی نشست اور جملوں کی ساخت اجنبی نہ معلوم ہو۔ علمی کتابوں کے ترجمے کے لیے اردو میں اچھے نمونے موجود ہیں۔ مرزا ہادی رسوا، عبدالباری، خلیفہ عبدالحکیم، عبدالمجید سالک ، فلسفۂ جذبات اور مکالمات برکلے والے مولانا عبدالماجد ، ڈاکٹر ذاکر حسین، ڈاکٹر عابد حسین ، سید ہاشمی فرید آبادی ، عزیز احمد، اختر حسین رائے پوری ، امتیاز علی تاج ، لطیف الدین احمد ، مبارز الدین رفعت ، رحم علی الہاشمی نے قابل قدر ترجمے کیے ہیں ۔ پھر بھی انہیں حرف آخر سمجھنا غلط ہوگا ۔ ترجمے کا ایک اہم اصول یہ ہے کہ اصل میں کمی بیشی نہ کی جائے ۔ یورپ میں ایک بین قومی جماعت ہے جس کا نام F I T ہے ۔ یعنی فیڈریشن آف انٹرنیشنل ٹرانسلیٹرس ۔ اس نے مترجموں کا ایک چارٹر مرتب کیا ہے ۔ اس کی ایک دفعہ میں کہا گیا ہے کہ مشکل فقروں کو مختصر کرنا یا انہیں خارج کر دینا غیر اخلاق بات ہے ۔ اس کے چند اور اصول قابل ذکر ہیں ؛ ایک تو ”اصل زبان کے بجائے کسی درمیانی زبان کے ذریعے سے ترجمہ ایک ایسا مفاہمہ ہے جو غیر تسلی بخش ہے“۔ دوسرے ”نظم کا نثر میں ترجمہ فن پارہ کہلانے کا مستحق نہیں“ ۔ تیسرے ”اسٹائل اور فارم کے معاملے میں عملی طریقۂ کار اپنانا چاہیے“۔ مثلاً اصل زبان میں اگر کوئی ذو معنی لفظ ہے تو اس کا لفظی ترجمہ مناسب نہیں ۔ یہاں اس سے ملتا جلتا ترجمے کی زبان کا لفظ ہونا چاہیے جس میں بھی رعایت ہو ۔

اب میں چند مشہور ترجموں سے مثالیں دے کر یہ واضح کرنا چاہتا ہوں کہ ان کو نظر انداز کرنے سے کیا خرابیاں پیدا ہوئیں ۔

ارسطو کی کتاب فن شاعری (Poetics) یا بوطیقا مغربی تنقید کا صحیفۂ اول کہی جا سکتی ہے ۔ آج تک مغربی تنقید میں اس کے ایک ایک لفظ اور ایک ایک فقرے پر بحث ہوتی ہے اور اس سے برابر نئے معانی اور مطالب نکالے جاتے ہیں ۔ یہ ان بنیادی کتابوں میں سے ہے جس کا ترجمہ دنیا کی قریب قریب ہر زبان میں موجود ہے ۔ اردو میں اس کا ترجمہ عزیز احمد نے ۱۹۴۱ء میں کیا تھا ۔ عزیز احمد کا ترجمہ عام طور پر اچھا ترجمہ سمجھا جاتا ہے مگر ارسطو کی ٹریجڈی کی تعریف کا ترجمہ ملاحظہ کر کے آپ خود فیصلہ کیجیے ۔ پہلے انگریزی ترجمہ ملاحظہ کیجیے پھر عزیز احمد کا ترجمہ ۔ پھر اس پر تنقید اور آخر میں میرا ترجمہ ۔

> **"Tragedy, then, is an imitation of an action that is serious, complete, and of a certain magnitude; in language embellished with each kind of artistic ornament, the several kinds being found in separate parts of the play; in the form of action, not of narrative, through pity and fear, effecting the proper purgation of these emotions".**
>
> **BUTCHER**

«ٹریجڈی نقل ہے ، کسی ایسے عمل کی جو اہم اور مکمل اور ایک مناسب عظمت (طوالت) رکھتا ہو جو مزین زبان میں لکھی گئی ہو جس سے حظ حاصل ہوتا ہو لیکن مختلف حصوں میں مختلف ذریعوں سے جو درد مندی اور دہشت کے ذریعے اثر کر کے ایسے ہیجانات کی صحت و اصلاح کرے» ۔

اردو میں اوقاف کا استعمال کم ہی ہوتا ہے ۔ عزیز احمد نے صرف الٹے کامے اور وقفے کا استعمال کیا ہے ۔ حالانکہ انگریزی میں کاما اور

کولن کا استعمال ہے ، جملہ ایک ہی ہے ۔ عزیز احمد نے ایک جملے کا ترجمہ چار جملوں میں کیا ہے اور بعض ضروری الفاظ چھوڑ دیے ہیں ۔ بعض الفاظ کے ترجمے سے بھی میں متفق نہیں ہوں ۔ serious کا ترجمہ اہم کے بجائے سنجیدہ ہونا چاہیے تھا ۔ Magnitude کے لیے اردو میں سامنے کا لفظ حجم موجود ہے ، اس کے لیے مناسب عظمت اور پھر قوسین میں طوالت لکھنا غیر ضروری تھا ۔ مزین زبان کی وضاحت اس طرح کی گئی ہے کہ جس سے حظ حاصل ہو In the form of action not of narrative کا ٹکڑا جو بہت اہم ہے چھوڑ دیا گیا ہے پھر purgation یا katharsis کے لیے ایک لفظ کے بجائے دو لفظ صحت و اصلاح ہیں اس لیے میرے نزدیک نہ تو اس شکل میں مطابق اصل ترجمہ ہے نہ لفظی ترجمہ بلکہ ادھورا اور ناقص ترجمہ ہے ، اس سے اصل کی روح مجروح ہوتی ہے ۔ میرے نزدیک انگریزی عبارت کا ترجمہ کچھ اس قسم کا ہونا چاہیے :

"پس ٹریجڈی ایک ایسے عمل کی نقالی ہے جو سنجیدہ ، مکمل اور مناسب حجم کا ہو ، جس کی زبان ہر قسم کی فنی آرائش سے مزین ہو اور (آرائش کی) یہ قسمیں کھیل کے مختلف حصوں میں پائی جاتی ہوں ۔ یہ عمل کے روپ میں ہو نہ کہ بیانیہ کے ، اور رحم اور خوف کے ذریعے سے جذبات کا تنقیہ کرے" ۔

تنقیہ کے علاوہ ایک اور لفظ بھی استعمال کیا جا سکتا ہے تزکیہ ، فرق یہ ہے کہ تنقیہ طب کی اصطلاح ہے اور تزکیہ تصوف کی ۔ تنقیہ میں فاسد مادے کے خارج ہونے اور پھر جسم کے نظام کے صحت پانے کا مفہوم موجود ہے ۔ تزکیہ میں رفعت اور پاکی کا مفہوم ہے ، صحت و اصلاح سے وہ مفہوم ادا نہیں ہوتا جو میرے نزدیک katharsis کا ہے ۔

بہر حال یہ تو واضح ہو ہی گیا کہ بنیادی کتابوں کے متن کا ترجمہ قطعی طور پر مطابق اصل ہونا چاہیے ۔ اس میں تبدیلی کی گنجائش ہے نہ

اضافے کی ، نہ کسی لفظ یا فقرے کو حذف کرنے کی ، اس لیے اردو میں فن شاعری کے ایک اور ترجمے کی ضرورت ہے اور اس کے لیے عنوان بوطیقا جیسے ثقیل عربی لفظ کی بجائے صرف فن شاعری یا شعریات لکھنا کافی ہوگا ۔ جمیل جالبی نے ایلیٹ کے کچھ مضامین کا ترجمہ کیا ہے جس کی عام طور پر تعریف کی گئی ہے ۔ ایلیٹ کے مضمون Tradition & Individual Talent کے ایک اقتباس اور جالبی کے ترجمے پر غور کیجیے ۔ دیکھیں آپ کے پلے کیا پڑتا ہے :-

"I am alive to a usual objection to what is clearly part of my programme for the metier of poetry. The objection is that the doctrine requires a ridiculous amount of erudition (pedantry), a claim which can be rejected by appeal to the lives of poets in any pantheon. It will even be affirmed that much learning deadens of perverts poetic sensibility.

"میں اس عام اعتراض سے واقف ہوں جو شاعری کے پیشے کے سلسلے میں میرے پروگرام کا ایک حصہ ہے ۔ اعتراض یہ ہے کہ نظریے کے لیے مضحکہ خیز حد تک تبحر علمی اور اصول پرستی کی ضرورت پیش ہے اور جو ایک ایسا دعویٰ ہے جسے شاعروں کے حالات زندگی پر نظر ڈالنے ہی سے رد کیا جا سکتا ہے ۔ اس سے یہ بھی پتہ چلے گا کہ زیادہ علمیت شاعرانہ احساس و ادراک کو کند کر دیتی ہے یا روک دیتی ہے" ۔ ۱۳۲-۳۳

پہلے جملے کا ترجمہ بالکل غلط ہے ۔ ترجمہ یہ ہونا چاہیے : "میں اس عام اعتراض سے واقف ہوں جو شاعری کے پیشے کے سلسلے میں میرے پروگرام کے ایک حصے پر کیا جاتا ہے" ۔ اب دوسرا جملہ لیجیے : "اعتراض

یہ ہے کہ نظریے کے لیے مضحکہ خیز حد تک تبحر علمی (اور اصول پرستی) کی ضرورت پڑتی ہے اور جو ایک ایسا دعویٰ ہے جسے شاعروں کے حالات زندگی پر نظر ڈالنے سے ہی رد کیا جا سکتا ہے''۔ یہاں نظریہ سے پہلے لفظ 'اس' ضروری ہے ، پھر یہ جملہ اچھی اردو کا جملہ نہیں ہے نیز اس میں pantheon کا ترجمہ سرے سے کیا ہی نہیں گیا ۔ میرے نزدیک اس جملے کا ترجمہ یہ ہونا چاہیے : ''اعتراض یہ ہے کہ میرے نظریے کے مطابق مضحکہ خیز حد تک تبحر علمی (بلکہ فضیات مآبی) درکار ہے یہ ایک ایسا دعویٰ ہے جو کسی مقدس سلسلے کے شعراء کے حالات زندگی کی روشنی میں رد کیا جا سکتا ہے ۔ بلکہ (معترض) اس پر بھی زور دیں گے کہ زیادہ عالمیت شعری حسیت کو مردہ کر دیتی ہے یا مسخ کر دیتی ہے''۔

ادبی تنقید کا ترجمہ اگرچہ آسان نہیں مگر فلسفے کا ترجمہ بہر حال بہت مشکل ہے ۔ اردو میں افلاطون کی ریاست کا وہ ترجمہ جو ڈاکٹر ذاکر حسین نے کیا ہے، عابد حسین کا کانٹ کا 'تنقید عقل محض' کا ترجمہ، خلیفہ عبدالحکیم ، مرزا ہادی رسوا اور مولانا عبدالباری کے ترجمے مجموعی طور پر اچھے ترجمے ہیں ۔ اگرچہ عقل محض کے مقابلے میں میرے نزدیک عقل خالص شاید بہتر ہوتا ۔ ظفر حسین نے 'انواع فلسفہ' کے نام سے Types of philosophy کا بہت اچھا ترجمہ کیا ہے سماجی علوم میں قابل قدر ترجمے روسو کے معاہدہ عمرانی کا ترجمہ ڈاکٹر محمود حسین کا کیا ہوا، کینس کا 'روزگار شرح سود و زر' ابو سالم کا کیا ہوا ۔ ولیم جیمس کی مشہور کتاب 'نفسیات و واردات انسانی' کا ترجمہ خلیفہ عبدالحکیم کا کیا ہوا، اچھے ترجمے کہے جا سکتے ہیں ۔ پھر بھی سماجی علوم میں بہت سی بنیادی کتابوں کا ترجمہ ہونا باقی ہے ۔ ہمارے دستور کا جو ترجمہ اجمل خان ، محمد مجیب اور ہارون خان شروانی نے کیا ہے وہ نہ صرف اردو میں انگریزی کی روح کو برقرار رکھنے میں کامیاب ہے بلکہ اس کی خوبی یہ ہے کہ ترجمہ معلوم نہیں ہوتا ۔ تمہید ملاحظہ ہو :

''ہم ہند کے لوگوں نے پوری سنجیدگی کے ساتھ فیصلہ کیا ہے کہ ہند کو ایک پورے اختیار والی عوامی جمہوریہ بنائیں اور

اس کا بندوبست کریں کہ اس کے ہر شہری کو انصاف ملے ، سماجی ، معاشی اور سیاسی آزادی ملے ، خیال ، بیان ، عقیدے ، مذہب اور عبادت کی برابری ملے ، حیثیت اور موقعوں میں ۔ اور ہم نے طے کیا ہے کہ شہریوں کے درمیان اس طرح بھائی چارہ پھیلائیں کہ فرد کا وقار اور قوم کی ایکتا محفوظ رہے ۔''

جہاں تک تصنیف و تالیف کا سوال ہے اس کے مسائل ترجمے کے مسائل سے خاصے مختلف ہیں ۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ تصنیف کے کئی درجے ہوتے ہیں ۔ ایک ابتدائی درجہ عام فہم انداز میں کسی مسئلے کے مبادیات کو بیان کرنے کا ہے ، مثلاً سیاسیات یا نفسیات پر کوئی ابتدائی کتاب لکھی جائے، جو بی ۔ اے کے طالب علموں کے لیے ہو ۔ اس میں نصاب کی ضروریات کو ملحوظ رکھنا ہوگا ، طلبا کی عمر اور استعداد اور ان کی زبان پر قدرت کو بھی دیکھنا ہوگا ۔ موضوع کے مناسب معیار کو دیکھنا ہوگا تاکہ اس ابتدائی منزل پر کوئی غلط نظریہ ذہنوں میں رائج نہ ہو جائے یہاں اصطلاحات کی تعداد زیادہ نہ ہوگی مگر یہ ضروری ہوگا کہ یہ اصطلاحات مستند ہوں۔ بی ۔ اے کی منزل کے بعد ایم ۔ اے کی منزل کے لیے کتابیں لکھوانے کا سوال پیدا ہوتا ہے ۔ یہاں کتاب کا معیار خالص علمی ہوگا ۔ زبان کے عام فہم ہونے پر اصرار نہ ہوگا ۔ کیونکہ یہ کتابیں اس مضمون میں مہارت حاصل کرنے کے لیے پڑھی جائیں گی ۔ اس منزل پر موضوع پر جدید ترین معلومات ضروری ہوں گی ۔ ترقی اردو بورڈ ابھی تو پہلی منزل کے لیے کتابیں لکھوا رہا ہے دوسری منزل بعد میں آئے گی ، اس لیے اس منزل کے مسائل پر بعد میں غور کیا جا سکتا ہے ۔ یہاں تو یہ کہنا کافی معلوم ہوتا ہے کہ میرے نزدیک ہر مضمون کے لیے تراجم اور تصانیف میں ایک خاص تناسب ہونا چاہیے ۔ تراجم کی اہمیت مسلم مگر تصانیف بی ۔ اے کی منزل پر زیادہ اہم ہیں ۔ اس لیے اگر کسی مضمون پر چار کتابوں کا ترجمہ کر دیا گیا ہے تو کم سے کم چار تصانیف بھی ہونی چاہیں ۔ اگر کوئی ماہر فن اپنی نظر اور تجربے کی بناء پر سیاسیات یا

اقتصادیات پر کوئی کتاب لکھے گا تو ہمارے طلبا اس مضمون سے زیادہ آشنا ہوں گے ۔ ترجمے کے ذریعے اتنا ابلاغ نہیں ہوتا جتنا تصنیف کے ذریعے ہوتا ہے ۔ سماجی علوم میں ویسے ہی ہندوستانی ماحول اور مشرق فضا کو دیکھتے ہوئے تصانیف کی زیادہ ضرورت ہے کیوں کہ مقامی مثالوں کے ذریعے بات کو زیادہ اچھی طرح ذہن نشین کرایا جا سکتا ہے ۔ ترجمہ بہر حال پٹری پر چلنے کے مترادف ہے اور طالب علم اس پٹری سے اکتا بھی سکتا ہے ۔ تصنیف میں زیادہ آزادی ہے اور اس ذریعے سے زیادہ سے زیادہ وسیع فضا کی سیر کی جا سکتی ہے ۔

اب مجھے اصطلاح سازی کے اصولوں کے متعلق کچھ کہنا ہے ۔ اس سلسلے میں ہمیں چاہیے کہ وحید الدین سلیم کی "وضع اصطلاحات" کو خاص طور سے نظر میں رکھیں ۔ جو لوگ آنکھ بند کر کے انگریزی کی اصطلاحات بجنسہ لینا چاہتے ہیں ۔ ان کے متعلق وحید الدین سلیم کی رائے یہ ہے :

"انگریزی زبان میں علمی الفاظ کی اس قدر کثرت ہے کہ اگر ان سب الفاظ کو ہم بگاڑ کر جاہلوں کی زبان کی خراد پر چڑھا کر اپنی زبان میں داخل کر لیں تو ہماری زبان کا قدرتی حسن و جمال اور اس کے خط و خال کی قدرتی خوبیاں سب خاک میں مل جائیں گی ۔ اجنبی زبان کے الفاظ کی کیسی ہی تراش خراش کیوں نہ کی جائے ان میں اجنبیت کی بو اس قدر باقی رہتی ہے کہ اہل زبان ان سے مانوس نہیں ہوتے ۔ ہماری زبان میں موجودہ اصلی الفاظ کی تعداد ہی بمقابلہ مہذب زبانوں کے کم ہے ۔ اگر انگریزی زبان کے تمام علمی الفاظ توڑ مروڑ کر اس میں بھر دیے جائیں تو ان کی تعداد اصلی الفاظ سے بھی زیادہ ہو جائے گی ۔ اور ہماری زبان کی لچک اور نزاکت سب ملیا میٹ ہو جائے گی اور ہم ایسی زبان بولنے اور لکھنے پر مجبور ہوں گے جس کے الفاظ کا کوئی جزو گوش آشنا اور مانوس نہ ہوگا ۔ برخلاف اس کے اگر ہم انگریزی زبان کے

علمی الفاظ کے مقابلے میں ایسے الفاظ وضع کریں جن کے اجزا پہلے سے گوش آشنا اور مانوس ہوں تو اس سے نہ تو زبان کی سلاست اور لوچ میں کوئی فرق آئے گا اور نہ ہم اپنی زبان میں کسی ناگوار مداخلت کے مرتکب ہوں گے ۔"

(وضع اصطلاحات)

میں اس نظریے سے مجموعی طور پر اتفاق کرتا ہوں ، ہاں صرف یہ عرض کرنا ہے کہ اس کے باوجود بعض ایسے الفاظ کے لیے جو بالکل نئے ہیں اور جن کا مفہوم کسی طرح سے پرانے الفاظ سے ادا نہیں ہو سکتا ، ایک دو جگہ انگریزی سے الفاظ لینے میں کوئی حرج نہیں ۔ ان کی تعداد اتنی ہونی چاہیے کہ مجموعی طور پر زبان کی جی نی اس (genius) مجروح نہ ہو ۔ یہاں میں نے لفظ مزاج یا بناوٹ استعمال نہیں کیا کیونکہ میرے نزدیک جی نی اس (genius) میں انفرادیت کا جو پہلو ہے وہ مزاج یا بناوٹ سے ظاہر نہیں ہوتا پھر لفظ جی نی اس (genius) ہمارے صوتی نظام سے ہم آہنگ ہے اس لیے ایسے الفاظ اپنے میں کوئی حرج نہیں ۔ ویسے بھی آئیڈیلزم ، مارکسزم ، بیلٹ ، ایڈی پس کمپلکس (oedipus complex) ایٹم ، میزائل ، ٹریبونل ، اٹارنی ، شیڈیول کو بجنسہ لے لینا بہتر ہوگا ۔ ان کا ترجمہ کرنے کی ضرورت نہیں ۔ یہ لفظ اخباروں میں استعمال ہونے لگے ہیں ۔

پھر بھی اصطلاح سازی کے لیے ہر جدید زبان کو کسی کلاسیکل زبان کی مدد کی ضرورت ہوتی ہے ۔ اگرچہ وحید الدین سلیم نے اس پر زور دیا تھا کہ اردو کے آریائی مزاج کا خیال رکھا جائے گا مگر جامعہ عثمانیہ کی اصطلاحوں میں طبا طبائی کے اثر سے عربی سے ضرورت سے زیادہ فائدہ اٹھایا گیا ۔ چند سال ہوئے کابل میں ترجمے پر ایک سیمینار ہوا تھا جس میں ایران ، افغانستان ، تاجکستان ، ہندوستان اور پاکستان کے نمائندے شریک ہوئے ۔ میں اس سیمینار میں موجود تھا ۔ ایران کے نمائندوں نے بتایا کہ ان کے یہاں عربی کی اصطلاحوں کے بجائے اب فارسی کی اصطلاحیں برتنے کا رواج ہے ۔ انہوں نے اس کے علاوہ فرانسیسی کے اثر

کی وجہ سے بہت سی فرانسیسی اصطلاحوں کو مفرس کر لیا ہے ۔ ظاہر ہے کہ تہنید کا یہ عمل ہمارے یہاں بھی جاری ہے اور جاری رہنا چاہیے مگر کچھ الفاظ پہلے فارسی سے پھر عربی سے پھر انگریزی سے لینے پڑیں گے اردو چونکہ ایک جدید ہندوستانی زبان ہے اور اس کی بنیاد کھڑی بولی ہے جو شورسینی اپ بھرنش سے نکلی ہے اس لیے اس کا تعلق اپ بھرنش کے ذریعے سنسکرت سے ہے ۔ سنسکرت کا رشتہ فارسی سے مسلم ہے ۔ کیونکہ دونوں زبانیں انڈو ایرین خاندان سے تعلق رکھتی ہیں اس لیے اگرچہ ہم اردو کی جی نی اس (genius) کو دیکھتے ہوئے سنسکرت کی اصطلاحوں سے زیادہ فائدہ نہیں اٹھا سکتے پھر بھی فارسی کی اصطلاحوں پر زیادہ توجہ کر کے سنسکرت سے قریب رہ سکتے ہیں ۔ مثال کے طور پر ہم (Sub-Conscious Conscious, Unconscious) کے لیے شعور ، تحت شعور اور لا شعور کی اصطلاحیں استعمال کرتے ہیں ، ان کی جگہ فارسی کی اصطلاحیں آگہی ، زیر آگہی اور نا آگہی بے تکلف استعمال کر سکتے ہیں ۔ اس لیے میرے نزدیک اصطلاح سازی کے لیے ہمارا اصول یہ ہوگا کہ موجودہ اصطلاحوں میں سے جو ہمارے آریائی مزاج کے مطابق ہیں ۔ وہ بجنسہ رہنے دی جائیں ۔ نئی اصطلاحیں فارسی کی مدد سے بنائی جائیں اور جہاں انگریزی کی اصطلاح لینی ناگزیر ہو وہاں انگریزی کی اصطلاح تھوڑے سے تصرف کے ساتھ اختیار کر لی جائے ۔ اس سلسلے میں ہمیں ایک اصول کو چھوڑنا پڑے گا ۔ جس پر اب تک ہمارے علماء اور خواص سختی سے عمل پیرا رہے ہیں ۔ یعنی فارسی اور ہندی الفاظ کی ترکیب سے احتراز یا ہندی اور عربی کے مرکب الفاظ بنانے سے پرہیز ۔ ہماری زبان میں جب لب سڑک ، فوق البھڑک ، چٹھی رساں ، تماہی جیسے الفاظ موجود ہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ ہم حسب ضرورت اس اصول پر اپنی اصطلاحیں نہ بنائیں ۔ در اصل انشا نے 'دریائے لطافت' میں اردو زبان کی خود مختاری کا جو اعلان کیا تھا ۔ اس سے پورا فائدہ اٹھانا ضروری ہے ۔ انشا نے کہا تھا کہ جو لفظ عربی یا فارسی کا اردو زبان میں مستعمل ہو گیا ۔ وہ اب اردو کا لفظ ہے اور اسے اردو کے قاعدے سے برتنا چاہیے ۔

اس اصول پر عمل کرنے سے ہماری بہت سی مشکلات دور ہو سکتی ہیں ۔ میں چند مثالوں سے اپنی بات واضح کرنا چاہتا ہوں ۔ ہم Nature کے لیے فطرت ، Natural کے لیے فطری ، Naturalism کے لیے فطرت پرستی کی اصطلاحوں سے کام لیتے ہیں لیکن Supernatural کے لیے مافوق الفطرت کہتے ہیں حالانکہ فوق فطری کافی ہوگا ۔ اسی طرح International کے لیے بین الاقوامی کے بجائے بین قومی لکھنا زیادہ مناسب ہوگا ۔ نشاۃ الثانیہ کے لیے نئی بیداری مناسب ہوگا ۔ ہم نے مذہب میں صلوٰۃ کے بجائے نماز کو اختیار کر لیا لیکن بہت سی اصطلاحیں عربی کی نہیں چھوڑ سکتے ، حالانکہ فارسی کی اصطلاحیں یا ہندی کی وہ اصطلاحیں جو ہمارے صوتی نظام سے متصادم نہ ہوں ہمارے لیے زیادہ قابل قبول ہونی چاہیں ۔

اس سلسلے میں ایک بات اور قابل غور ہے ۔ انگریزی میں لفظ نیشن سے نیشنلائز اور آئیڈیل سے آئیڈلائز بنایا گیا ہے ۔ اس نہج پر ہمیں قومیانہ اور آورشیانا لکھنا چاہیے ۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ Idealization کے لیے آدرشیانے کا عمل Nationalization کے لیے قومیانے کا عمل لکھنا پڑے گا ۔ قدیم اردو میں خرچ سے خرچنا استعمال ہوتا تھا ۔ وحید الدین سلیم نے اس اصول پر برتانا کی حمایت کی تھی ۔ اس طرح سے بہت سے فعل بنائے جا سکتے ہیں ۔ گو اس میں شک نہیں کہ ہر جگہ یہ اصول کام نہیں دے گا ۔ انگریزی میں بھی نہیں دیتا ۔

اصطلاح سازی بہر حال ضروری ہے ۔ نئے خیالات کے لیے نئے الفاظ لینے ہوں گے ۔ ہاں حالی کے بنائے ہوئے اصول کے مطابق اس معاملے میں احتیاط سے کام لینا ہوگا ۔ نئے الفاظ نئے ذہن کی تشکیل کرتے ہیں ۔ اردو کو جدید ذہن سے ہم آہنگ کرنے کے لیے جدید اصطلاحیں بنائے بغیر چارہ نہیں ۔ مگر کوئی جدید چیز بالکل جدید نہیں ہوتی ، یہ کسی پرانی اور بھولی بسری روایت کی تجدید ، توسیع یا ترمیم ہوتی ہے اس لیے ہمارا فرض ہے کہ ہم اپنے سارے خزانے کو کھنگالیں ، پیشہ وروں کی اصطلاحات سے مدد لیں اور نئی چیزوں ، نئے خیالات ، نئے لفظوں کو

حسب ضرورت اختیار کریں ۔ یہ نہیں سوچنا چاہیے کہ یہ کتابیں کون پڑھے گا ۔ طالب علم تو نہ اردو جانتے ہیں نہ ہندی نہ انگریزی ۔ ایک طرف ہمیں اس پر اصرار کرنا چاہیے کہ جن کی مادری زبان اردو ہے وہ ثانوی تعلیم اردو کے ذریعے سے حاصل کریں تا کہ ان کی بنیاد مضبوط ہو ۔ دوسری طرف ہمیں ان کو افسانہ و افسوں اور جذبات کے محشرستان کے بجائے فکر و نظر کی رفعتوں کی طرف مائل کرنا ہوگا تا کہ وہ جدید ذہن پیدا کر سکیں اور اس جدید ذہن کی مدد سے موجودہ دور کی پر پیچ اور نت نئے روپ بدلنے والی زندگی کے فرائض سے عہدہ برآ ہو سکیں ۔ ترقی اردو بورڈ کے سامنے اپنے تراجم اور تصانیف کے کام میں یہی آدرش ہونا چاہیے ۔ اس آدرش تک پہنچنے میں دیر لگے گی مگر تاریخ بتاتی ہے کہ اچھے راستے وہی ہوتے ہیں جو سب سے لمبے ہوتے ہیں کیونکہ انہیں میں خلوص ، ریاض اور خون جگر کی مکمل نقش گری ہو سکتی ہے ۔

کتابیات

کتابیات

نام کتب	مصنف/مؤلف	ناشر
اردو نثر کا آغاز و ارتقاء (۱۹ویں صدی کے اوائل تک)	ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ	کریم سنز پبلشرز جمشید روڈ ۳ کراچی ۵ پاکستان ۱۹۷۸ء
داستان تاریخ اردو	حامد حسن قادری	اردو اکیڈمی سندھ کراچی ایڈیشن سوم ۱۹۶۶ء
اردو کی نثری داستانیں	ڈاکٹر گیان چند	انجمن ترقی اردو بابائے اردو روڈ کراچی ۱۹۶۹ء
دنیا کا قدیم ترین ادب ۳۰۰۰ق م تا ۱۷۵۰ق م	ابن حنیف	کاروان ادب ملتان صدر ۱۹۸۲ء
مشرق و مغرب کے نغمے	میراجی	اکادمی پنجاب ٹرسٹ لاہور ۱۹۵۸ء
اردو زبان میں علمی اصطلاحات کا مسئلہ	مولوی عبدالحق	انجمن ترقی اردو پاکستان کراچی ۱۹۶۹ء
اسرار خودی منظوم اردو ترجمہ	عبدالرشید فاضل کوکب شادانی	ادارہ تنویرات علم و ادب لاہور ۱۹۵۶ء
روح مشرق (پیام مشرق کا منظوم ترجمہ)	عبدالرحمن طارق	ملک دین محمد اینڈ سنز لاہور ۱۹۵۲ء
جاوید نامہ (منظوم ترجمہ)	رفیق خاور	اقبال اکادمی پاکستان لاہور ۱۹۷۷ء

رموز فطرت	عبدالرحمن طارق	ملک دین محمد اینڈ سنز تاجران کتب اشاعت منزل بل روڈ لاہور طبع سوم ۱۹۶۵ء
ترجمان اسرار (منظوم ترجمہ)	جسٹس ایس اے رحمان	مکتبہ کاروان لاہور ۱۹۵۲ء
دو آتشہ (ارمغان حجاز کا اردو روپ)	گل بادشاہ	مکتبہ عالیہ لاہور ۱۹۷۷ء
حکمت کلیمی (مثنوی پس چہ باید کرد اے اقوام مشرق کا اردو ترجمہ)	ظفر احمد صدیقی	علی گڑھ یونیورسٹی پبلشرز علی گڑھ ۱۹۵۵ء
مغربی تصانیف کے اردو تراجم	مولوی میر حسن صاحب	دفتر ادارہ ادبیات اردو رفعت منزل خیریت آباد انڈیا ۱۹۳۹ء
ساز مغرب اردو آہنگ میں (حصہ ہفتم)	حسن الدین احمد	ولا اکیڈمی حیدر آباد انڈیا ۱۹۷۹ء
دو گونہ (امیر خسرو کی سو غزلوں کا اردو غزل میں ترجمہ)	صوفی تبسم	نیشنل بک فاؤنڈیشن اسلام آباد ۱۹۷۵ء
ظفر علی خان ادیب و شاعر	ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار	مکتبہ خیابان ادب ۳۹ چیمبرلین روڈ لاہور ۱۹۶۷ء
سرا پردہ افلاک	صوفی تبسم (مترجم)	ادارہ ثقافت اسلامیہ لاہور ۱۹۷۷ء
فن ادارت	ڈاکٹر مسکین حجازی	مرکزی اردو بورڈ لاہور

rekhta

ارسطو سے ایلیٹ تک	ڈاکٹر جمیل جالبی	نیشنل بک فاونڈیشن اسلام آباد طبع دوم
عکس	امجد اسلام امجد	مجلس ترقی ادب لاہور ۱۹۷۶ء
وقت کی راگنی	محمد حسن عسکری	
جذبات نادر	مرتبہ ممتاز حسن	انجمن ترقی اردو بورڈ کراچی ۱۹۳۱ء
مقدمات عبدالحق	مولوی عبدالحق	ایضاً
خطبات عبدالحق	ایضاً	،،
تاریخ ادب اردو جلد اول و دوم	ڈاکٹر جمیل جالبی	مجلس ترقی ادب لاہور

(ب) مقالہ جات (ایم۔ اے۔ اردو جامعہ پنجاب لاہور)

میراجی شخصیت و فن از انوار انجم ۱۹۶۳ء

مولانا صلاح الدین احمد از عاتکہ صدیقہ ۱۹۶۵ء

بیسویں صدی میں انگریزی نظموں کے منظوم اردو تراجم از شاہد جمالہ ۱۹۷۲ء

(ج) رسائل

ادب لطیف لاہور ستمبر ۱۹۵۳ء

رسالہ اردو سہ ماہی انجمن ترقی اردو اورنگ آباد دکن جنوری ۱۹۳۷ء

ماہنامہ شام و سحر لاہور دسمبر ۱۹۸۱ء

اقبال ریویو (انڈیا) جنوری/اپریل ۱۹۷۸ء

ادبی دنیا جنوری ۱۹۵۳ء

ایضاً مارچ ۱۹۵۵ء

سوغات لاہور جدید نظم نمبر

صحیفہ لاہور ستمبر ۱۹۸۳ء

قومی زبان کراچی جولائی ۱۹۸۳ء

اردو نامہ لاہور اگست ۱۹۸۲ء

پیامی (یونیسکو) ستمبر ۱۹۸۳ء

(د) انگریزی کتب

1. Arnold, Mathew, *Essays literary and critical.*
2. Belloc Hilaire, *Selected essays on Translation on Tranlating Homer.*
3. Catford J. C. (1965), *A linguistic theory of translating Oxford University Press.*
4. Eliot, T. S. *The sacred wood 'Eruipides and Professor Murray.*
5. *Encyclopaedia of Linguistics* by A. R. Meetham and R. A. Hudson.
6. Pound, Ezra, *Literary essays of Ezra Pound,* 'Translators of Greek'. 'Early Translators of Homer'.
7. Reuban A. Brower on Translation.
8. URE J. N. (1963) *Types of Translation and Translatability* Oxford.
9. *Approaches to Translation* by Peter Newmark Pergamon Press London (U.K.) 1981.
10. *The Third Language* by Alan Duff, Paris 1981.
11. *The Manipulation of literature, studies in literary translation* edited by Theo Hermans, University of London.
12. Steiner, George, 1974. After Babel, *Aspects of language and translation,* London Oxford University Press,

rekhta

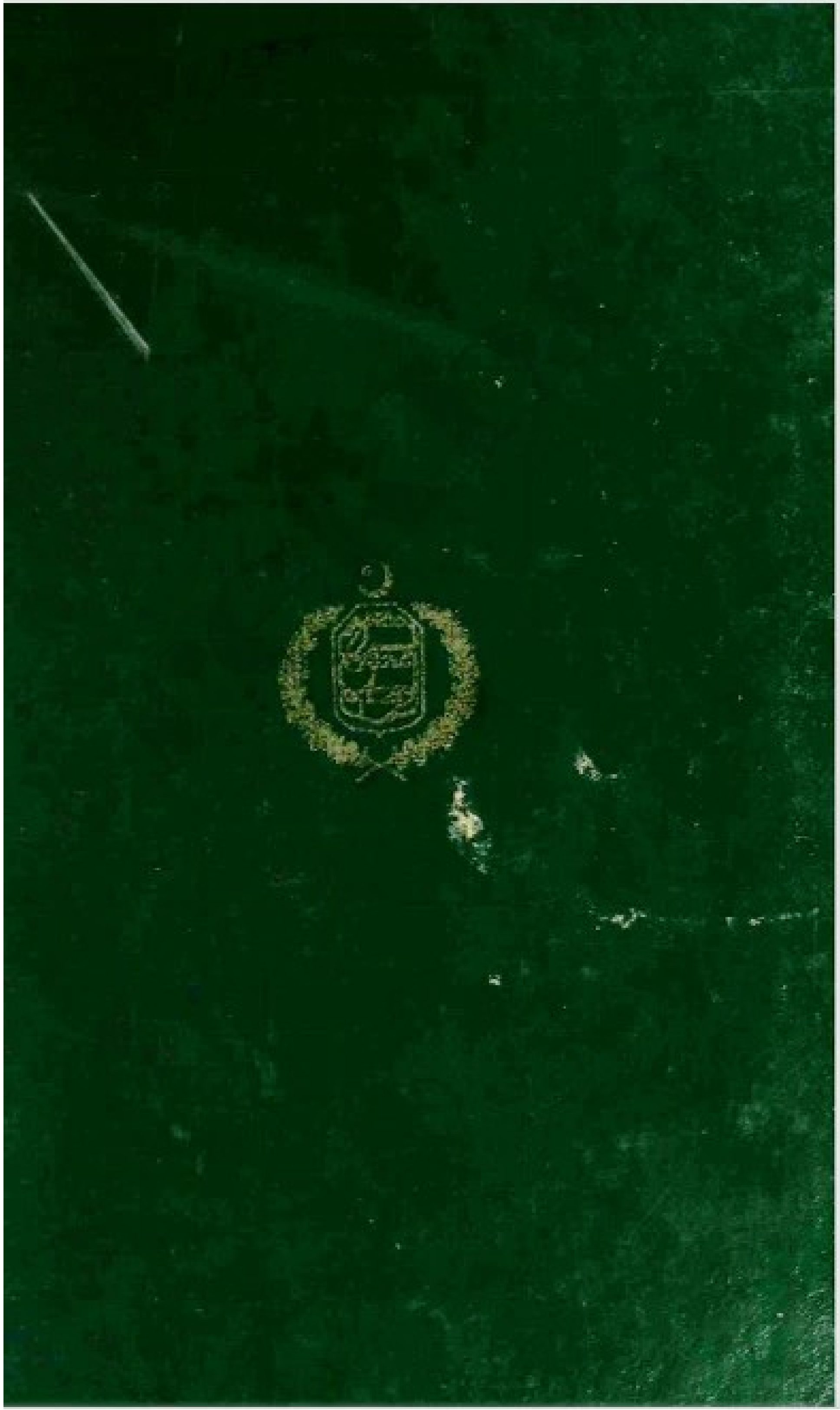

13. *Catalogue of the Persian*, Turkish, Hindustani and Pushto *mss in the* Bodlein Library by A.P.L. Beeston Vol. 1–4.
14. *A Supplementary Handlist of the Muhammadan mss* preserved in the libraries of the University Colleges of Cambridge by Edward G. Browne.

صاحب طرز نثر نگار اور شاعر ابن انشاء مرحوم
کی یاد میں یہ کتاب انجمن ترقی اردو ہند
کی لائبریری کو پیش کی جاتی ہے۔